مثنویاتِ میر

کا

تہذیبی مُطالعہ

شمامہ بلال

مثنویاتِ میر کا تہذیبی مُطالعہ

شمامہ بلال

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش لکھنؤ

کے مالی تعاون سے

شائع ہوئی۔

انتساب

اپنے والد

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

کے نام

اللہ اُن کے مرقد کو نور سے بھرے، کہ اُنھیں کی

ہمّت افزائی کی بدولت

مَیں

اس منزل تک پہنچ سکی۔

*—— شمامۂ بلال

فہرست مضامین

پہلا باب

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

پیش لفظ

پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

(صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

شمامہ بلال ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ ہیں جس کا علم و دانش کی روایت سے گہرا تعلق ہے۔ اُن کے والد بزرگوار جناب عبدالسلام قدوائی ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ناظم دینیات رہے ہیں، اور وظیفۂ حسن خدمت پر سبک دوش ہونے کے بعد اب شبلی کے یادگار ادارے دارالمصنفین کے نائب ناظم ہیں۔ شمامہ بلال نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم۔ اے (اردو) کی ڈگری کی شرائط پوری کرنے کے لیے میر کی مثنویوں پر ایک مقالہ لکھا تھا، یہ مقالہ ڈاکٹر محمد ذاکر کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا جنھوں نے شمامہ کو لگن، محنت اور سلیقے سے کام کرنے کی راہ دکھائی بعد میں یہی مقالہ زیرنظر تالیف کا محرک ہوا۔ مجھے مسرت ہے کہ شمامہ اپنے مقالے میں برابر ترمیم و اضافے کرتی رہیں، اور انھوں نے مثنویات میر کی ترتیب و تدوین کے کام کو بھی ہاتھ میں لے لیا جس کی اس وقت ضرورت بھی ہے۔ شمامہ نے میر کے عہد اور اُن کی شخصیت میں مطابقت اور عمل و ردعمل کے رشتے کی اہمیت پر نظر رکھی ہے اور عشقیہ اور دیگر مثنویوں کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ میر خدائے سخن ہیں اور اگرچہ اردو کی اقلیم شعر میں اُن کے شعر شور انگیز کی دھوم ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی، لیکن آزادی کے بعد کی نسلوں نے جس طرح میر کی آواز میں اپنے عہد کے اسرار کی سرگوشیاں سُنی ہیں۔ ایسا اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ میر کی عظمت کا اعتراف کرنا یا خراج عقیدت پیش کرنا ایک بات ہے، اور شعری مزاج سے اس حد تک ہم آہنگی محسوس کرنا کہ شاعر کس عہد کے

شعری و روحانی نسب نامے کا نقطۂ آغاز معلوم ہونے لگے بالکل دوسری بات ہے۔ میرؔ نے "ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، قریہ، قصبہ، دیہہ دیار" میں ہی شہرت کے جس ہنگامے کو اپنی زندگی میں محسوس کر لیا تھا نسلی و زمانی گونج اس کی بالکل دوسری جہت ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ آنے والے ہر نئے عہد اور ہر نئی نسل کو میرؔ کی باتوں پر سر دُھننے کے لیے کوئی نہ کوئی نیا گوشہ، نئی جہت یا نیا نکتہ سوجھتا ہی رہے مثلاً تاریخ و معاشرت کے فوری اثرات سامنے کی بات ہیں، لیکن میرؔ کی مثنویوں کا عرب ایرانی طلسماتی داستانوں اور قدیم آریائی کاویہ اور کتھاؤں کی روایت سے وہ کون سا خاموش رشتہ ہے جو غیر محسوس طور پر ذہن و وجدان کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ لیکن نظروں سے اوجھل رہتا ہے، یا خواب و خیال، دریائے عشق یا شعلۂ شوق کی ماورائی فضا میں صدیوں کی دھندلی یادوں کے وہ کون سے قافلے ہیں جو ان دیکھے ہونے کے باوجود جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ آنے والے دور کا قاری ان باتوں پر غور کرنے پر مجبور ہو۔ میرؔ کی شاعری رسمی معنی میں نگار خانہ نہیں، بلکہ تخلیقِ شعر کا ایسا نادر ورثہ اور پیچ در پیچ طلسم ہے جس میں ہر عہد اور ہر نسل میں ہر "وادیِ آبادی" کے لوگ اپنی اپنی حسرتوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی ایسی گونج سنتے رہیں گے جو اگرچہ ان کے کانوں میں تھی لیکن اس سے پہلے انھوں نے نہیں سُنی تھی۔

زیر نظر تالیف کی مدد سے قارئین کو میرؔ کی مثنویوں کو پڑھنے کا ایک اور موقع ہاتھ آئے گا، اور یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک طالبہ اسکالر کے ذوق و شوق اور محنت کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اس کی داد سب دیں گے۔

گوپی چند نارنگ

۵ ستمبر ۱۹۷۷ء

کچھ اِس کتاب کے بارے میں!

زیرِ نظر کتاب "مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ" ایم۔ اے (اردو) کے تخصیصی مقالہ (DESSERTATION) کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر تنویر احمد علوی شعبۂ اردو کے صدر تھے جب انھوں نے میرے مقالہ کے لیے موضوع تجویز کیا تو مجھے فکر لاحق ہوئی کہ شاید اس پر زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں۔ اس لیے میں نے ان سے موضوع تبدیل کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے مجھے سمجھایا کہ میر پر تو بہت کام ہو چکا ہے اُن کی مثنویوں پر بھی لکھا گیا ہے لیکن باقاعدگی سے ان کی مثنویات پر جامع کام ہنوز نہیں ہوا۔ اگر تم نے یہ کام کر لیا تو بہت مفید ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس کام کو کرنے کا تہیہ کر لیا۔ پھر جیسے جیسے میں نے میر کی مثنویات کا بغور مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ نہ صرف یہ موضوع بہت دل چسپ ہے بلکہ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ میری اپنی پہلی کوشش ہے اس کا فیصلہ خود قارئین کریں گے کہ میں کس حد تک اس کوشش میں کامیاب ہو سکی ہوں۔

قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر اس مقالہ کے آخر میں میر کی ان مثنویات کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے جو اس کا تہذیبی پس منظر پیش کرتی ہیں۔ یہ مثنویات کلیاتِ میر مُرتبہ عبدالباری آسی سے لی گئی ہیں جو کم یاب ہے اور فی الجملہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ میر کے زمانے میں مثنوی کے ساتھ غزل لکھنے کا بھی رواج تھا۔ میر کی مثنویات میں بھی

جا بجا یہ بات نظر آتی ہے۔ لیکن میں نے بہ خوفِ طوالت غزلیں شامل نہیں کیں۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات ہیں۔ ان حالات کے مطالعہ کے بغیر میر کی مثنویات کے فکری پس منظر کو سمجھنا مشکل ہے۔

دوسرے باب میں میر کے حالات زندگی اور اُن کی شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں مثنوی کی تعریف اور میر سے پہلے دکن اور شمالی ہند کی تمام مثنویات کا مختصر ذکر ہے۔ تاکہ مثنوی کا تدریجی ارتقا سامنے آجائے۔

اس مقالہ کا موضوع مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ ہے اس لیے باب چہارم میں تہذیب کے معانی اور اس سے متعلق بعض امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

پانچواں اور آخری باب خود میر کی مثنویات کا تہذیبی مطالعہ ہے۔ مثنویات کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ حصہ اول میں عشقیہ مثنویاں ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں دیگر مثنویات پر گفتگو کی گئی ہے۔

اردو مثنویوں پر اس سے پہلے کام ہو چکا ہے۔ بالخصوص عبدالقادر سروری، پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اس صنفِ سخن پر خاص توجہ صرف کی ہے جس سے مجھے بڑی مدد ملی۔ میر تقی میر پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے قابلِ قدر کام سے بھی اس مقالہ کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کے سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ انھوں نے ہی یہ موضوع تجویز کر کے مجھے کام کرنے کا موقعہ دیا اور اپنے ایک کم یاب مضمون سے بھی جو پاکستان کے ایک رسالہ میں قسط وار

شائع ہوا تھا، مجھے مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔

اپنے استاد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر طرح میری ہمت افزائی کی اور اپنی مصروفیات کے باوجود میرے اس مقالہ کو وقیع تر بنانے میں اہم مشورے دیے۔

یہ مقالہ استاد محترم جناب ذاکر صاحب کی نگرانی میں لکھا گیا تھا جن کی میں بے حد ممنون ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر اُن کی رہنمائی نہ ہوتی تو اس ہفت خواں کو طے کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوتا اور اپنے شفیق و محترم خالو جناب مصطفےٰ علی اسیر کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

شمامہ بلال
۱۰۰۔ ذاکر نگر۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پہلا باب

اٹھارویں صدی کا ہندوستان

سیاسی ، سماجی اور معاشی حالات

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کا زمانہ بڑے انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا ، یہ انتشار اور افراتفری اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوئی ، اورنگ زیب نے پچاس سال تک اس ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کے سنبھالنے کی جد و جہد کی ۔ سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی ، اس کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جنگ میں بسر ہوا ۔ لیکن فوجی قابلیت ، سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر اس نے انتشار کی قوتوں کو دبا دیا اور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے جانشینوں کے لئے ایک عظیم الشان سلطنت چھوڑی ، خانہ جنگی سے بچانے کے لئے اس نے ملک کو اپنے بیٹوں میں ایک وصیت کے ذریعہ تقسیم کر دیا ، لیکن اسکے تنگ دل اور کم نظر جانشینوں نے وصیت کی طرف کوئی توجہ نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہو کر مخالف قوتوں کے دبانے میں صرف کی جا سکتی

تھی آپس میں ہی لڑکر ختم ہوگئی۔ اورنگ زیب سے پہلے اور اورنگ زیب کے بعد کی تاریخ میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاگیردارانہ طرزِ حکومت کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی شرط مضبوط حکمران کی موجودگی تھی۔ مغل دربار ہمیشہ امراء کی سازشوں کا مرکز رہا تھا لیکن عظیم مغل حکمران کا رعب اور حکمت عملی کی وجہ سے یہ اس پر قابو پالیتے تھے، اورنگ زیب کے بعد بادشاہوں کے بجائے "بادشاہ گر" پیدا ہوچکے تھے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ مزید کمزور ہوکر گرنے لگا اور حکومت کی اس کمزوری کی وجہ سے صوبے آزاد ہونے لگے۔ امراء سر اٹھانے لگے اور جاگیرداروں نے بدنامی کی ایک عام فضا پیدا کردی، جس نے اقتصادی زوال اور معاشی انحطاط کی رفتار کو اتنا تیز کردیا کہ دہلی اور اس کا بادشاہ بقول شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ "کاسۂ گدائی در دست گرفتہ" نظر آتے تھے۔۔۔ ان حالات میں یہی ہونا چاہیے تھا کہ ملک کے وہ تمام افراد جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کرسکتے ہوں قسمت آزمائی کے لئے تیار ہوجائیں چنانچہ سکھ، مرہٹہ اور جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامہ کیا اور صورت حال روز بروز خراب تر ہونے لگی، سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور اقتصادی انحطاط کے زمانے میں ایک بیرونی طاقت نے اپنے قدم مستحکم کرنے شروع کردیئے۔

اورنگ زیب کا پہلا جانشین بہادر شاہ اول تھا جو بڑا فیاض اور رحم دل تھا، مگر جسے شاہ بے خبر کہہ کر یاد کیا جاتا تھا، اس کے بعد جہاندار شاہ

سلہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ذکتوب، دوم ص ١١

تخت نشین ہوا وہ اس قدر نکما تھا اور عیش پرستی کا دلدادہ کہ اس نے اپنی محبوبہ لال کنور پر ایک سال میں دو کروڑ روپے خرچ کر دیئے۔ لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کو صرف اس وجہ سے جمنا میں ڈبوا دیا کہ لال کنور کو اس قسم کے تماشوں میں بڑا مزا آتا تھا۔ دربار میں عیش و طرب کی محفلیں گرم رہتی تھیں، بڑی کثرت سے جرائم کئے جاتے تھے۔ فرخ سیر تخت نشین ہوا تو ملک کی حالت اور بھی خراب ہو گئی، اسے گھوڑوں سے بڑی دلچسپی تھی، ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے بیکار بندھے رہتے تھے، اس گرتے ہوئے مالی نظام پر نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے ضرب آخر کا کام کیا۔ ارون (Irwim) کے خیال کے مطابق۔ نادر شاہ ستر کروڑ سے زیادہ روپیہ ہندوستان کے باہر اپنے ملک لے گیا۔ اس کے بعد امراء کے محلات اور شاہی خزانے خالی ہو گئے۔ احمد شاہ کے زمانے میں خزانے کی یہ حالت تھی کہ ملازمین کو تنخواہیں بھی بڑی مشکل سے ملتی تھیں، بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔
فضول خرچی میں بادشاہ کے ساتھ امراء بھی مبتلا تھے، اندرونی اختلافات اس قدر اور اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ درباری امراء اپنے ذاتی مفاد کے لئے ملک کو بیچ ڈالنے کے لئے تیار تھے۔ جب نادر شاہ کی فوجیں منزل بمنزل بڑھتی ہوئی دہلی کی طرف آرہی تھیں اور نظام الملک بار بار بادشاہ کو مقابلے کے لئے اکساتا تھا تو دوسرے امراء صرف اس خیال سے بادشاہ کو بہلا پھسلا کر روک رہے تھے کہ نظام الملک کی بات اونچی نہ ہونے پائے آخرکار نادر شاہ کی فوجیں کرنال تک آگئیں تب شاہی لشکر مقابلے کیلئے نکلا، اس قیامت خیز موقع پر بھی امراء اپنی ذاتی چپقلشوں اور خود غرضیوں

ہو چکے تھے اور شاہ عالم نے مشرقی اضلاع میں اپنے قیام کے دوران انہیں باقاعدہ بنگال کی دیوانی سپرد کر دی تھی ۱۸۵۷ء تک یہی لینی تمام ہندوستان پر حکومت کرتی رہی، شاہی خاندان کے زوال کے بعد ہی سے جب کہ ہندوستان کے مختلف نواب شکستہ سلطنت کے علاقوں کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر صوبہ ان چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں سے نالاں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بحیثیت مملکت کے سیاسی ترقی اور اہمیت حاصل کرنی شروع کر دی۔ اگر سچ پوچھئے تو حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے لوگ آپس کی خانہ جنگیوں سے اس قدر پریشان تھے کہ ان کو دیسی حکومت کے استقبال کرنے میں خوشی ہوتی جو ان کے ساتھ مذہبی رواداری برتتی تھی اور ان کے جان و مال کی محافظ تھی۔ اس طرح ۱۸۵۷ء میں اس پرُدرد داستان کا خاتمہ ہو گیا۔

میر نے اپنے زمانے کے عروج و زوال کی پوری داستان صرف اس شعر میں سمو دی ہے ؎

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں ٭ یاں کبھی سرو دگل سے تن تھے (۱)

---

(۱) مرزا محمد رفیع سودا نے دہلی کی تباہی و بربادی کا نقشہ بڑے پر درد الفاظ میں کھینچا ہے۔

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گذر ٭ نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے سوکھی پڑی ہیں روشیں ٭ خاک اڑتی ہے ہر اک طرف تھم گیا تھا بہار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر ٭ عندلیب ایک ہے بے بال و پر و شکار
بدم سرد بصد حسرت و صد سوز جگر ٭ دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے یہ نالہ زار

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

سلطنت کی بدحالی کا اثر ہندوستانی تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بھی پڑا۔ شاعر جو کہ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی نے نہ صرف اس کو دیلہ رنگا بچھیا بلکہ اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دراصل میر کی زندگی کے حالات اور ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اس بدحالی کے اثرات کو پیش کرتا ہے۔ میر کی تمام شاعری اس دور کی دلی اور اس کی تہذیبا زندگی کے افسانے کو دہرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں دل اور شہر دلی کی تباہی کا ذکر بار بار آیا ہے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی ؛ کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
دلی کی ویرانی کا کیا مذکور ؛ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ایک اور جگہ پر انہوں نے کہا ہے۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یہ حالات تھے جس کے باعث بڑے بڑے اہل کمال دلی چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں خصوصاً فیض آباد اور پھر لکھنؤ میں جا بسے۔ جہاں کے حالات دلی کی نسبت زیادہ سازگار تھے۔ یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سا حال لکھنؤ اور اودھ کا بھی بیان کر دیا جائے۔

محمد شاہ کے زمانے میں محمد امین سعادت خان نے جو بعد میں نواب سعادت علی خان برہان الملک کے نام سے مشہور ہوئے، اودھ میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سو سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ برہان الملک نے ۱۷۲۲ء سے ۱۷۳۹ء تک حکومت کی، ان کے انتقال کے بعد

صفدر جنگ تخت نشین ہوئے (۱۷۵۴ - ۳۹ء) ان کے عہد میں فیض آباد اودھ کا پایہ تخت قرار دیا گیا۔ صفدر جنگ کے بعد نواب شجاع الدولہ تخت نشین ہوئے (۱۷۷۵ - ۵۴ء) انہوں نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں اقامت اختیار کی لیکن فیض آباد سے قطعی طور پر تعلق ختم نہیں کیا کبھی کبھی فیض آباد آیا کرتے تھے، لیکن لکھنؤ کے قیام کے دوران ان کی انگریزوں سے جنگ ہوئی اور پھر صلح ہو گئی، تو نواب احمد خان بنگش کے مشورے سے انہوں نے لکھنؤ کے بجائے پھر فیض آباد کو رونق بخشی۔ فیض بخش مصنف "تاریخ فرح بخش" نے اپنی کتاب میں اس زمانے کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔

آخر کار میں شہر پہونچا ہر جگہ ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے جنہیں دیکھ کر پریں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک فوجوں کے ڈھولوں اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں، گھڑیالوں کی صداؤں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ خچر، شکاری کتے، بیل گاڑیاں اور توپ خانے والی گاڑیاں قطار در قطار چلی جاتی تھیں۔ لباس فاخرہ پہنے شرفاء دہلی کے اعزا اور رشتہ دار طلب۔ ہر شہر کے گانے بجانے والے قوال بھانڈ اور طوائفیں کوچوں میں نظر آتی تھیں۔ چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری تھیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور فلاکت کا گزر نہ تھا، نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق کے ایسے خواہاں تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد شاہجہاں آباد کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا (۱)

---

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری از ابو اللیث صدیقی ص ۲۲ - ۲۱

گیئں تھوڑے ہی دنوں بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ لکھنؤ پایۂ تخت بنایا جائے، چنانچہ نواب شجاع الدولہ اور ان کے ارکانِ سلطنت نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور چند ہی برسوں میں یہ شہر فیض آباد سے بہت آگے نکل گیا بلکہ دہلی کا مقابلہ کرنے لگا۔ اب دہلی کے پریشان حال شرفاء اور اہلِ کمال یہاں آ کر بسنے لگے۔ جن میں میر سوز، سودا، حسرت، میر حسن اور میر تقی میر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شجاع الدولہ کا ۱۷۷۵ء میں انتقال ہو گیا تو آصف الدولہ انکے جانشین ہوئے۔ ان کے عہد میں بھی دولت کی ریل پیل تھی۔ یہ لوگ اگرچہ حقیقی سیاسی اقتدار سے محروم تھے، لیکن مالی اعتبار سے ان کی حالت بظاہر بہت اچھی تھی، چنانچہ ان کے عہد میں بھی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ دولت و ثروت کی کثرت تھی اس لئے شعراء کی سرپرستی میں بھی کوئی دقت نہ تھی۔ اس زمانے میں دہلی کے شعراء برابر لکھنؤ پہونچ رہے تھے، انہیں کے عہد میں میر نے بھی ادھر کا قصد کیا اور یہیں پر بس گئے۔

میر کی زندگی کے مختصر حالات

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر نے کتنی زندہ حقیقت بیان کی ہے کہ ایسا فرد جسے دنیا اس کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے یاد کرے بڑی مشکلوں سے سالہا سال بعد پیدا ہوتا ہے اس خیال کی تائید شاعر مشرق علامہ اقبال بھی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پیدائش پرورش اور تعلیم۔ میر ۱۷۲۲ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے تفصیلی حالات اپنی کتاب "ذکر میر" میں لکھے ہیں ان کے آبا و اجداد حجاز کے رہنے والے تھے، تلاش معاش کی فکر میں حجاز سے آگرے کا رخ کیا۔ یہاں کے حالات موافق تھے اس لیے یہیں اقامت اختیار کر لی۔ ان کے دادا اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز کر دیے گئے تھے لیکن گوالیار میں جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے نے عالم شباب میں وفات پائی اور چھوٹے لڑکے جن کا نام محمد علی تھا میر کے والد تھے میر نے لکھا ہے کہ وہ بڑے متقی پرہیزگار تھے، ہمیشہ یادالٰہی میں مصروف رہتے تھے اس لئے آپ کو علی متقی کا خطاب دیا گیا، آپ نے شیخ کلیم اللہ[1] اکبر آبادی

---

(۱) شاہ کلیم اللہ کی جو بلند حیثیت میر کے بیان سے معلوم ہوتی ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ صوفیا کے تذکروں مشاہیر کی سوانح عمریوں میں ان کا مفصل ذکر ملتا لیکن دو ایک تذکروں کو چھوڑ کر دوسری کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا، اس سے بھی

(جو آگرہ کے ایک بزرگ تھے) سے تعلیم حاصل کی۔

میر لکھتے ہیں کہ والد، جس وقت ہوش میں آتے تو مجھے نصیحت کرتے۔

"بیٹا عشق الٰہی اختیار کرو اور خدا سے لو لگاؤ، آخرت کی فکر لازم ہے، یہ دنیا گزرنے والی ہے اور زندگی وہم ہے وہم کے پیچھے دوڑنا عبث ہے، چل چلاؤ لگا ہے اسلئے زادِ راہ کی فکر کرو ورنہ اس منزل تک پہونچنا ممکن نہیں اس سے رجوع کرو، عالم جس کا آئینہ ہے اور اختیار اس کو سونپو جس کو ہم اپنے میں ڈھونڈتے ہیں، تمہارا وجود بے اس کے نہیں اور اس کی نمود بے تمہارے نہیں" (۱)

میرے والد بہت خود دار تھے، امراء اور رؤسا کی ملاقات سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ کا) اندازہ ہوتا ہے کہ میر نے بچپن کی دھندلی یادوں کو ذرا عقیدت سے شاندار رنگ دیدیا ہے۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ "صرف تاریخ محمدی مصنفہ مرزا عارف بدخشی ۱۱۰۰ھ ہجری کے مرنے والوں میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے "شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی جامع المعقول و المنقول در اکبر آباد فوت شد" تاریخ محمدی کے مصنف نے "رائق المبین" نامی کسی کتاب کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات لکھی ہے، اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مصنف کون ہے ملاحظہ کیجئے میر کی آپ بیتی (حاشیہ) ص ۲۲۔

(۱) میر تقی میر حیات اور شاعری از خواجہ احمد فاروقی۔

مزید ملاحظہ ہو میر کی آپ بیتی از نثار احمد فاروقی ص ۳۴، ۳۵

حتی الامکان گریز کرتے تھے یہاں تک کہ جب کوئی ملنے کے لئے مصر ہوتا تو صاف کہہ دیتے کہ میں فقیر اور تم امیر۔ مجھ سے تمہاری کیا مناسبت۔

میر کے والد نے دو شادیاں کی تھیں، میر دوسری بیوی کی اولاد تھے ان کے والد ایک دن حالتِ اضطراب میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور لاہور پہونچے پھر لاہور سے دہلی کا رخ کیا تبین (ذکر میر کے مطابق) دہلی میں معتقدین کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا اور وہ (والد) بقولِ میر خلوت پسند اتنے تھے کہ اپنے سائے سے بھی گھبراتے[1] تھے آخر ایک رات چپکے سے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ بیانہ میں (جو آگرہ کے راستے میں پڑتا ہے) سید امان اللہ سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ ان کے مرید ہو گئے میر کو ان سے بڑی عقیدت تھی، سات سال کی عمر سے میر نے انکے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ سید امان اللہ بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ جہاں کہیں بھی جاتے میر اُن کے ہمراہ ہوتے اس طرح ان کے ساتھ بزرگوں کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

میر کو امان اللہ کے ساتھ بایزید نامی ایک درویش کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا ان بزرگوں سے میر کو بڑی عقیدت تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں ان بزرگوں کی بے خودی اور سرمستی ہی میر صاحب کے پیش نظر رہی ہے۔

ملنے والوں پھر ملئے گا ہے وہ عالم دیگر میں ؛ میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو ؛ دیر سے انتظار ہے اپنا

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۴۴

گلی میں اس کی کیا سو گیا نہ بولا پھر ٭ میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا
ابھی میر دس سال ہی کے تھے کہ ان کے ہر دلعزیز منھ بولے چچا
امان اللہ کا انتقال ہو گیا، اس حادثہ سے میر کو بہت صدمہ پہنچا اور والد
تو اس حادثہ کی تاب ہی لا سکے اور کچھ ہی عرصہ بعد اپنے عزیز ترین مرید
سے جا ملے۔

والد کی آنکھ بند ہوتے ہی ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، بڑے
بھائی نے بے مروتی پر کمر باندھ لی اور ان کی مطلق پرواہ نہ کی۔ یہیں سے
ان کی محرومیوں اور آرزوؤں میں بھرے دل کی پامالی کا آغاز ہوتا ہے۔
میر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد میں نے فلک کی بے مروتی دیکھی
زمانے کے ستم جھیلے، لیکن فلک یا زمانے کا کیا قصور۔ میرا ہی
ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا ستارہ میرے سر سے اٹھ
گیا، تو کچھ بھی کیا میری قسمت نے کیا، سوائے میرے اپنے ہاتھ
کے کسی اور کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا، لیکن میں نے غیرت کو اپنے
ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ہرگز کسی کے در پر سائل بن کر نہ
گیا، خدا نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہیں کیا اور مجھے
میرے بھائی کا جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دست نگر نہ بنایا"[1]

میر کا مشہور شعر ہے جو ان کے اپنے قول کی تائید کرتا ہے ؎

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

---

(۱) میر کی آپ بیتی۔ ص ۸۹

لیکن مشکلات اور پریشانیوں سے تنگ آکر مجبوراً وطن (آگرہ) کو خیرباد کہنے کی ٹھانی اور دلی کی طرف روانہ ہوئے، یہاں بھی ادھر ادھر کی کچھ عرصہ خاک چھانی، آخر ایک دن خواجہ محمد باسط سے ملاقات ہوگئی جو صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے۔ انہیں ان پر بہت ترس آیا اور وہ انہیں اپنے چچا کے پاس لے آئے صمصام الدولہ بہت شفقت سے پیش آئے اور انہوں نے ایک بہت معمولی سا وظیفہ مقرر کردیا جو انکے انتقال کے بعد ختم ہوگیا۔ آخر مایوس ہوکر پھر آگرے کا رخ کیا (۱۱۵۲ھ) اگرچہ والد کی وفات کے بعد اب وطن میں کوئی ان کا ہمدرد باقی نہ رہا تھا، لیکن وطن کی محبت انہیں پھر کھینچ لائی، لیکن یہاں بھی ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ میر نے لکھا ہے کہ۔

"جو لوگ دردیش کی زندگی میں میری خاک پا بھی سرمہ سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے تھے اب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے" (۱)

لہٰذا عین عالم شباب میں دوبارہ دہلی آئے اور اس مرتبہ انہوں نے اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو[۲] کے یہاں قیام کیا۔ لیکن

---

(۱) میر کی آپ بیتی۔ ص ۹۳

(۲) خان آرزو حافظ محمد حسن کے سگے ماموں تھے میر کی سوتیلی ماں ان کی بہن تھیں، ان کا شمار ان کے زمانے کے بہت بڑے علماء اور محققین میں ہوتا تھا۔ فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ ان کی تصانیف میں نوادر الالفاظ، چراغ ہدایت، سراج اللغات، خیابان، عطیۂ کبریٰ، داد سخن، مجمع النفائس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دو دیوان فارسی کے بھی ہیں، میر، سودا اور درد اور مضمون وغیرہ نے بھی ان سے فیض حاصل کیا ہے۔

یہاں بھی گردش روزگار نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو یہ لکھ کر کہ "یہ فتنۂ روزگار ہے" میر سے انکو برگشتہ کر دیا۔ میر لکھتے ہیں۔

"وہ عزیز کے دنیا دار تھے، اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا برا چاہنے لگے، اگر میں سامنے پڑتا تو پھٹکارنے لگتے اور پیچھے پیچھے ہوتا تو اول فول بکتے، ہر وقت ان کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے میں کیا بیان کروں کہ ان سے کیا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کہ کیا رنج اٹھائے میں ہر چند صبر و ضبط کرتا لاکھ احتیاج ہو مگر ان سے ایک روپیہ بھی نہ مانگتا، لیکن وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے اگر ان کے ایذا دینے کا معاملہ تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے، میرا دکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا اور میں پاگل ہو گیا۔" (۱)

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۹۴۔ مزید ملاحظہ ہو میر نمبر از نثار احمد فاروقی ص ۲۰۔
اس وقت ہمارے سامنے صرف میر کا بیان ہے۔ خان آرزو یا حافظ محمد حسن کا بیان موجود نہیں ہے۔ جس کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جا سکے، نثار احمد صاحب اور عبدالباری آسی صاحب کا خیال ہے کہ حافظ محمد حسن اور خان آرزو کی ناراضگی کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو میر کا مذہب جو ان کے والد کے سامنے ہی ظاہر ہونے لگا تھا کہ میر شیعہ مذہب کی طرف راغب ہو رہے تھے اور میر کے والد اور میر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن سنی تھے، اور اس وجہ سے والد کی کتابوں سے بھی حافظ محمد حسن نے انہیں محروم رکھا کیونکہ یہ کتابیں تصوف کی تھیں اور میر کیلئے بیکار تھیں

اپنی اس دیوانگی کا ذکر انہوں نے "مثنوی خواب وخیال" میں بھی کیا ہے

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
یہ وہم غلط کار یاں تک کھنچا — کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑے — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے
مہ چاردہ کار آتش کرے — ڈر دل یاں تلک میں کہ جی تنگ پڑے
نظر آئے اک شکل مہتاب میں — کمی آئے جس سے خور و خواب میں

جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ اس اچانک حادثہ کا ان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ توازن دماغی کھو بیٹھے ، ان دنوں دہلی میں ایک خاتون رہتی تھیں جو میر کے والد کی مرید تھیں انہوں نے بڑی محبت اور دلسوزی سے میر کا علاج کیا آخر کار علاج کارگر ہوا اور میر پھر صحت یاب ہو گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خان آرزو کو بھی لکھ بھیجا ہو گا کہ میر کی تربیت نہ کریں کیونکہ اس زمانے کی معاشرت میں مذہبی عقائد کی بڑی اہمیت تھی خان آرزو سے ناراضگی کی دوسری وجہ میر کا معاشقہ بھی ہو سکتا ہے جسکا اظہار ان کی مثنوی خواب وخیال سے بھی ہوتا ہے جسے وہ جنونی کیفیت قرار دیتے ہیں ، ہو سکتا ہے اسی وجہ سے خان آرزو وغیرہ کی بدنامی ہوتی ہو کیونکہ اپنے زمانے کے وہ باحیثیت شخصیت تھے ، ورنہ خان آرزو سے اس قدر سنگدلی کی امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ ایک یتیم بچے پر اس طرح ظلم کرتے۔

لیکن میر کی انصاف پسندی قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں ان کا بڑا شاندار ذکر کیا ہے اور یہانتک کہدیا ہے کہ

"تا حال ہمچو ایشان بہندوستان جنت نشان ہم
نرسید بلکہ جنت در ایران می رود" (۱)

ایک طرف دلی کی ناگفتہ بہ حالت اور دوسری طرف عزیز و اقارب کی بے اعتنائی اور بے رخی ان سب نے مل کر میر کے نازک اور حساس دل کو اتنی کاری ضرب لگائی کہ ہمیشہ کے لئے انہیں غم کی مجسم تصویر بنا کر رکھدیا اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ان پر کیا گزرا ہوگا اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

کیا میں بھی پریشانئ خاطر سے قریں تھا
آیا یوں میں چمن میں جو جاتی رہی بہار

میر کو تعلیم کا شوق تو بچپن ہی سے تھا، انہوں نے اپنے والد اور چچا سے کچھ دینی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اس کے علاوہ خان آرزو کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے کا موقع ملا تھا، میر کے حالات نے ان کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری نہ رہنے دیا اور یہ سلسلہ کئی بار منقطع ہو گیا مگر ان کے شوق نے انہیں تحصیل علم کی طرف سے کبھی غافل نہ ہونے دیا، ان کے اس شوق سے متاثر ہو کر ایک بزرگ میر جعفر نے انہیں خود پڑھانے کی پیش کش کی میر جعفر نے بڑی محبت اور دلدہی سے انہیں پڑھانا شروع کر دیا لیکن میر کا ستارہ تو گردش میں تھا، اس لئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میر جعفر کو ایک ضرورت سے عظیم آباد واپس جانا پڑا اور میر کا تعلیمی سلسلہ

---

(۱) از نثار احمد فاروقی۔ ص ۔ ۷۲

پھر منقطع ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد میر کی ملاقات امروہے کے ایک صاحب سعادت علی، سے ہوئی، انہوں نے میر میں شعر و شاعری کی صلاحیت دیکھ کر ان کی ہمت افزائی کی، میر نے بھی دلچسپی لی اور کچھ ہی عرصہ میں اچھے شعراء میں ان کا شمار کیا جانے لگا۔

وہ خود لکھتے ہیں کہ

"مشق اتنی کرلی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا، میرے اشعار دلی کے گلی کوچوں میں پڑھے جاتے اور ادنیٰ و اعلیٰ کے کانوں میں پہنچ گئے تھے۔" (۱)

اور کچھ ہی دنوں بعد انہیں اپنی زبان پر اتنی قدرت حاصل ہو گئی کہ انہوں نے اس بات کے کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھا کہ

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا	مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دہلی اور آگرے کی آمد و رفت خان آرزو، حالات کی ناسازگاری اور میر کی لکھنؤ کو ہجرت۔	ادھر خان آرزو کی بدسلوکیاں روز بروز ترقی کر رہی تھیں لیکن میر ان کے اس بے برتاؤ کے باوجود انہیں کے ساتھ تھے

ایک دن خان آرزو نے انہیں کھانے پر بلایا اور کچھ اتنا سخت سست کہا کہ میر کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اور میر کھانا کھائے بغیر اس گھر پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر جامع مسجد کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ لیکن خوش قسمتی سے راستہ بھول گئے اور حوض قاضی کی طرف نکل آئے، یہاں ایک شخص سے ملاقات ہو گئی، وہ انہیں اپنے ہمراہ رعایت خان کے پاس لے آیا جو قمرالدین خاں وزیر کا بھانجہ تھا اور بہت پہلے ہی سے آپ کے دیدار کا

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص۔ ۹۸

متھی تھا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اپنے رفقاء میں شامل کرلیا کئی فوجی مہموں میں میر رعایت خان کے ہمسفر رہے ۱۱۶۱ھ میں جب احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے کی اطلاع ملی تو قمرالدین خان اور احمد شاہ اس کے مقابلے کے لئے دہلی سے روانہ ہوئے۔ رعایت خان نے بھی اس فوج میں شرکت کی تھی اس لئے میر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ شاہی فوج نے ابدالی کو شکست دی اور وہ واپس چلے گئے اس کے بعد رعایت خان نے معین الملک پسر قمرالدین خان کی رفاقت ترک کردی اور صفدر جنگ کے ساتھ جو بعد میں قمرالدین کی جگہ وزیر ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ میر کے دہلی پہونچنے کے کچھ عرصہ بعد راجہ بخت سنگھ کے ماتحت ایک مہم راجپوتانہ بھیجی گئی۔ رعایت خان اس فوج کے سپہ سالار تھے۔ میر بھی ہمراہ تھے لیکن لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور صلح ہوگئی، واپسی میں میر کو خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار پر بھی حاضری کا موقع ملا۔ بعد میں رعایت خان اور راجہ بخت سنگھ کے مابین کسی وجہ سے بدمزگی ہوگئی۔

میر نے بڑی تفصیل سے اس کشیدگی کے اسباب و نتائج بیان کئے ہیں کیونکہ یہ واقعات ہمارے موضوع سے خارج ہیں اس لئے ساری تفصیل نظرانداز کئے جاتے ہیں۔

رعایت خان کے ساتھ میر بھی دہلی واپس آگئے، ان تمام مصائب جھیلنے کے بعد اب ذرا سکون نصیب ہوا تھا بڑے آرام سے زندگی گذر رہی تھی لیکن یہاں بھی بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا، چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ رعایت خان مہتابی پر بیٹھا تھا ایک قوال لڑکا گا رہا تھا میر بھی موجود تھے، اس نے میر سے فرمائش کی کہ وہ اپنے چند اشعار اس قوال لڑکے

کو یاد کرا دیں تاکہ وہ اسے ساز پر گا سکے۔ میر نازک مزاج تو تھے ہی یہ بات برداشت نہ کر سکے گو رعایت خان کے بے حد اصرار پر چند اشعار یاد تو کرا دیے لیکن دو تین دن کے بعد ہی ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے

کچھ عرصہ بعد نواب بہادر جاوید خان کی ملازمت اختیار کی اسی زمانے میں تعلیم کی طرف پھر رجوع ہوئے اور علامہ تفتازانی کی بلاغت کی کتاب "مطول" کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے لیکن جلد ہی میر کے سرپرست بعض اختلافات کی بنا پر قتل کر دیے گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ میر کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ دیوان ان کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آئے، اس اثناء میں میر خان آرزو کی ہمسائیگی چھوڑ کر امیر خان انجام کی حویلی میں مقیم ہو گئے، میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" بھی اسی زمانے میں منظر عام پر آیا۔

اسی دوران وزیر اور بادشاہ میں کسی وجہ سے ناچاقی ہو گئی میر وزیر کے متوسلین میں سے تھے اس لئے انہیں بھی بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، آخرکار راجہ جگل کشور کی سفارش سے وہ راجہ ناگر مل تک پہونچ گئے جو دیوان خالصہ تھا پھر ۱۷۵۸ء میں جب احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا تو آئے دن کی مصیبتوں سے اکتا کر میر نے شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کیا اور راجہ سے اجازت لے کر مع اپنے متعلقین کے نکل کھڑے ہوئے۔ کوئی بھی منزل پیش نظر نہیں تھی، رات جوں توں ایک درخت کے نیچے بسر ہوئی، صبح کو راجہ جگل کشور کی بیوی سے ملاقات ہو گئی، وہ بہت ہمدردی اور محبت سے پیش آئیں اور وہاں سے اپنے ساتھ برسانہ لے آئیں، میر عشرہ محرم میں وہیں مقیم رہے اور عاشورہ کے دوسرے دن کمبھیر پہونچے،

سفر کے مصائب کا حال انہوں نے ایک مخمس میں بھی لکھا ہے۔

دلی میں بے وطنا پھرایا مرے تئیں　　　جا ماسے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں
خاصی کر بیٹھیں سرمہ بنایا مرے تئیں　　　ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں

یوں خشت خاک مجھ سے اپنے اس قدر شمار الخ

کمہیر میں راجہ کشن کے صاحبزادہ بہادر سنگھ نے جو صفدر جنگ کا نوکر تھا بڑی دلجوئی کی اور حسن سلوک پیش آیا لیکن پھر بھی یہ زمانہ میر کے لئے بڑی تنگدستی اور پریشان حالی کا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے پاس کھانے پینے کی اشیاء تک موجود نہیں ہوتی تھیں۔

ابھی میر کمہیر ہی میں تھے کہ راجہ بھی آ گئے۔ اگرچہ راجہ کے صاحبزادے بشن سنگھ نے انہیں اپنے یہاں ٹھہرا لیا تھا اور کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی انہیں اذیتیں اٹھانا پڑی تھیں، اس لئے اب وہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن راجہ نے انہیں اجازت نہیں دی۔

پانی پت (۱۷۶۱ء) میں مرہٹوں کی شکست کے بعد میر بھی راجہ کے ہمراہ دلی آ گئے۔ میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد جب ابدالی فوج دلی آئی تو اس نے پھر لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا اور اس میں میر کا مکان بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کے بعض اشعار میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں　　　تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا
دلی میں اب کے آ کر ان یاروں کو نہ دیکھا　　　کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بدیر آئے
منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آ　　　جس کا نہ سراغ سنا وے گزر گئے
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی　　　انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

خرابہ دلی کا اس حد تک کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں
واں ہم نے انہیں آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں

سورج مل نے اکبر آباد پر قبضہ کر لیا تھا یہ خبر مشہور تھی کہ شاہ عالم ایک طویل لشکر کے ساتھ آگرے کا قصد رکھتے ہیں، چنانچہ سورج مل نے ناگرمل سے مدد کی التجا کی اس لئے ناگرمل کو اکبر آباد جانا پڑا میر کو بھی ان کے ساتھ تیس سال بعد اکبر آباد آنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں آکر انہوں نے اپنے والد اور چچا کے مزاروں کی بھی زیارت کی۔ اعزا سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا لیکن زمانے کی گردش کے ساتھ اکبر آباد کی فضا بھی بدل گئی تھی اس لئے وہ صرف چار مہینے رہ کر راجہ کے ساتھ ہی واپس آگئے۔

جاٹوں کے ہاتھوں آگرہ بھی تباہی و بربادی کا شکار ہو گیا تھا، میر کو اپنے وطن کی یہ حالت دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آہ وطن میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لئے جاتا تھا جو بہت اچھی جگہ واقع ہے ..... اور آج مجھے ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر خوش ہو جاؤں، ایسا آدمی نظر نہیں آتا جس سے گفتگو کر سکوں، شہر کو ایک وحشتناک ویرانہ پایا۔ نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ اس طرح چار مہینے وطن مالوف میں گزارے رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں۔ سورج مل کے قلعوں میں واپس آگیا۔" (۱)

اس طرح راجہ ناگرمل کے ساتھ انہیں ایک بار اور وطن جانے کا اتفاق ہوا لیکن اس مرتبہ صرف پندرہ دن ہی قیام رہا، پھر کمھیر واپس آگئے

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۱۴۲-۱۴۳

سورج مل اور جواہر سنگھ کے مقتول ہو جانے کے بعد جو دو سکھ جاٹ انکے جانشین ہوئے وہ بدکردار تھے۔ اس لئے اہل دہلی کے ساتھ ان کا سلوک مناسب نہیں تھا۔ راجہ نے ایک دن اپنے دونوں لڑکوں اور اہل دہلی کو ہمراہ لیا اور آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

"وہاں یہ معلوم ہوا کہ شاہ عالم فرخ آباد میں ہیں۔ راجہ ناگرمل نے میر کو حسام الدین خان کے پاس جو شاہ عالم کے مزاج میں تصرف رکھتے تھے۔ عہد و پیمان درست کرنے کے لئے بھیجا اور میر نے وہاں جاکر ان سے باتیں کیں لیکن راجہ کے چھوٹے بیٹے نے اس بناء پر کہ اس کے برادران کلاں سے ربط تھا باپ کو سمجھایا کہ مرہٹوں کے پاس جانا بہتر ہے میر اس سے بہت آزردہ ہوئے لیکن چارہ کار نہ تھا۔ اپنے لواحق کے ساتھ راجہ کی معیت میں روانہ ہوئے دہلی پہنچے تو زن و فرزند کو قریب سرائے میں چھوڑ کر راجہ سے علیحدہ ہو گئے"۔(۱)

چند دنوں بعد ان کی ملاقات رائے بہادر سنگھ (ناگرمل کے صاحبزادے) سے ہوئی۔ میر نے جو ان پر گذری تھی بیان کی۔ اس نے انکی حتی الامکان مدد کی لیکن کچھ عرصہ بعد وہ کسی وجہ سے انکی خدمت نہ کرسکا۔ اس عرصہ میں ان پر دلی میں جو کچھ گذری اس کا تفصیل سے ذکر انہوں نے ذکر میر میں کیا ہے یہ شعر ان کی حالت کا آئینہ دار ہے

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاشی اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لہو پیا کرتے ہیں

---

(۱) میر تصیر از قاضی عبدالودود ص ۳۷-۳۸

اس قدر پریشانیوں میں گرفتار رہنے کے باوجود ولی میں ان کا دل زندہ تھا۔ وہ پابندی سے اپنے یہاں مہینے کی ہر پندرہ تاریخ کو مشاعرہ کرتے تھے شہر کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے دوست احباب برابر ملتے تھے اور ان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے ان کی شہرت اب شہر سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پھیل چکی تھی، دوسرے مقامات پر انکی کس قدر شہرت تھی یہ ان ہی کی زبانی سنئے۔

ملکوں ملکوں شہر شہروں قریہ قصبہ دیہہ دیار
شعر و بیت غزل پر اپنے ہنگامہ ہے گھر گھر آج

شعر ہمارے عالم سے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں اب یہ سخن مشہور نہیں

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ۔

•

ان کی غزلیں نہ صرف امراء کی محفلوں کی زینت تھیں بلکہ خانقاہوں میں صوفیا کو بھی وجد آتا تھا۔

مطرب نے غزل میر کی کل میں نے پڑھائی ÷ اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی
مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو ÷ مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کی

یہ حقیقت بھی ہے۔ ان کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے عیاں کرتے ہیں کہ میر وفقیر شاہ و گدا ہر ایک کے تعریب کی وجہ صرف ان کی شاعری تھی رسمی داد کی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں تھی کیونکہ وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ واہ کرا اٹھ گئے ÷ شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال ننگ ہے

ان کی شہرت کی وجہ سے مخالفین کی کثرت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ایک دن میر نے "اژدر نامہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور سرِ مشاعرہ پڑھی۔ اس نظم نے مخالفت کی چنگاری کو اور بھی بھڑکا دیا۔ حاتم کے شاگرد محمد امان نثار نے جو اس مشاعرے میں موجود تھے جواباً ایک غزل پڑھی، جس کا مقطع یہ ہے۔

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

بقاؔ بھی ان کے مخالفین میں تھے، انھوں نے بھی ان کی مخالفت کی ہے۔

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلی ہے

دلی کی تباہی و بربادی کا ان پر گہرا اثر تھا۔ دلی کی زبوں حالی کے ساتھ ساتھ معاندین کی مخالفت اور معیشت کی فکر نے انہیں خانہ نشین ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میر صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

اس وقت میر کی حالت بہت ابتر تھی، کئی بار دلی چھوڑنے کا عزم کیا لیکن بے سر و سامانی بیچ میں حائل ہو گئی اور ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے لیکن خوش قسمتی سے اچانک آصف الدولہ کو خیال آیا کہ میر کو بلوانا چاہیے، چنانچہ انہوں نے اپنے ماموں سالار جنگ سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا، خانِ آرزو سے ان لوگوں کے قدیمی تعلقات تھے اور ان کی وجہ سے میر سے بھی ربط تھا، لہٰذا انھوں نے کہا کہ "اگر زادِ راہ جائے تو ضرور آئیں گے"، اور اخراجاتِ سفر نواب آصف الدولہ سے فراہم کر کے میر کو روانہ کر دیا، یہ خط پاتے ہی میر نے رختِ سفر تیار کیا اور ۱۷۸۲ء میں اٹھاون برس کی عمر میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے اور دلی جو انہیں بہت

عزیز یقی کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی، دلی کو خیر باد کہتے ہوئے انہیں کس قدر دکھ تھا اس کا اندازہ آپ ان کے اس شعر سے بھی کر سکتے ہیں۔

جیسے کوئی جہاں سے جاتے رخصت اس حسرت سے ہو
اس کوچے سے نکل کر ہم نے رو بہ قضا ہر گام کیا

لکھنؤ میں میر کی عزت افزائی اور آصف الدولہ کی شاگردی

راستے میں فرخ آباد پڑا وہاں کے رئیس مظفر جنگ نے اصرار کیا کہ کچھ عرصہ یہاں بھی قیام کیجئے لیکن میر نے انکی درخواست منظور نہ کیا، لکھنؤ پہونچ کر نواب سالار جنگ[1] کے یہاں قیام کیا۔ وہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے اور آصف الدولہ کو ان کی آمد کی اطلاع کرادی۔ لکھنؤ میں اس زمانہ میں مرغ بازی کا عام رواج تھا۔ نواب اس سے شوق فرماتے تھے، چنانچہ ایک دن آصف الدولہ مرغ بازی کے لئے آئے، اچانک ان کی نظر میر پر پڑی فوراً پہچان لیا اور پوچھا کیا تم ہی میر تقی ہو، میر نے انہیں سلام کیا۔ نواب بہت محبت سے پیش آئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ خاص تک لے گئے۔ اپنے کچھ اشعار سنائے۔ میر نے بہت داد دی اور کہا "سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام ہے"۔ انہوں نے میر سے بھی کچھ سننے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ میر نے بھی چند شعر غزل کے سنائے، چند دنوں بعد آصف الدولہ نے انہیں بلایا میر نے ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا اور پھر نواب کے ملازمین میں داخل ہوگئے

---

(۱) سالار جنگ سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ حیدر آباد والے ہیں یہ حیدر آباد والے نہیں ہیں بلکہ آصف الدولہ کے ماموں ہیں۔

قصیدے کا مطلع یہ تھا۔

ہوا کئے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر
ہے سینۂ نانِ خشکی کے رنگ سادہ ضمیر

لیکن محمد حسین آزاد نے میر کے لکھنؤ جانے کا واقعہ اس طرح تحریر کیا ہے۔

"اگرچہ دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امراء وشرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا اور ان کے جواہر و کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے باعث عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اسلئے سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنی پڑی جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات کی۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق۔ اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے لکھنؤ پہونچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرائے میں اترے معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے رہ نہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔

ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا ہوا ایک رومال پٹڑی دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائینچے ناگ پھنی کی انی دار جوتی جسکی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری طرف کٹار ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز نئی تراشیں بانکے ٹیڑھے جوان انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے، میر صاحب بیچارے غریب الوطن زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے، میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں، رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ نے سنا اور دو سو روپے مہینہ کر دیا۔" (۱)

---

(۱) آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد ص ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰

میر کی آصف الدولہ سے ناراضگی

آصف الدولہ کے دربار میں میر کی بڑی قدرو منزلت تھی یہی وجہ ہے کہ میر اکثر سفر میں بھی ان کے ہمراہ رہے۔ ان کے شکارناموں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے لیکن زمانے کی ستم ظریفیوں نے انہیں نازک مزاج بنادیا تھا، ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ نے ان سے ایک غزل کی فرمائش کی لیکن میر نے انکار کردیا، آصف الدولہ ایک نواب تھے اور میر ایک شاعر، کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد میر کو یاد فرمایا میر خدمت میں حاضر ہوئے، نواب اس وقت حوض میں مچھلیوں کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھے، آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا آپ نے تو ہمیں فراموش ہی کردیا، پھر ایک غزل کی فرمائش کی۔ میر نے ان کی فرمائش پر یہ غزل سنائی۔

دکن اتر پورب پچھم ہنگامہ ہے ہر جاگہ
اودھم میرے شعر و سخن نے ہر جگہ مچایا ہے

لیکن نواب صاحب بدستور اپنی مچھلیوں کے تماشے میں مصروف رہے میر چار شعر سنا کر خاموش ہوگئے، نواب نے دوبارہ عرض کیا کہ کچھ سنائیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵ کا) میر کی آپ بیتی پڑھ کر محمد حسین آزاد کا خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ میر نے لکھا ہے کہ انہیں آصف الدولہ نے کرایہ بھیج کر بلوایا تھا، اسکے علاوہ آب حیات میں اور بھی کئی باتیں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر یقین نہیں آتا۔ آزاد نے یا تو کہیں پڑھا ہے یا پھر یہ باتیں اپنے بزرگوں سے سنی ہیں جو میر کے زمانے میں موجود نہیں تھے اس لئے ان سے غلطی ہوئی، تنخواہ کے متعلق بھی لطف نے تین سو روپے لکھے ہیں اور آزاد نے دو سو۔

میر نے کہا حضور آپ توجہ دیں تب ہی تو کچھ عرض کروں ۔ نواب نے جواب دیا جو شعر اچھا ہوگا وہ خود ہی اپنی طرف متوجہ کریگا ، میر کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے آصف الدولہ کو کنارہ کشی اختیار کرلی ۔ آزاد نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ایک مرتبہ نواب کی سواری ان کے سامنے سے گذری نواب نے ان کے دربار میں تشریف نہ لانے کی شکایت کی ۔ میر نے جواب دیا " بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء نہیں یہ کیا گفتگو کا موقع ہے ۔" (۱)

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد میر دربار سے تو وابستہ رہے لیکن دربار کا آنا جانا بند تھا ۔ آزاد نے لکھا ہے کہ :

"جب نواب آصف الدولہ مرگئے ، سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے ، وہاں کسی نے طلب نہ کیا ۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد پر سر راہ بیٹھے تھے ۔ سید انشاء خواص میں تھے ، نواب نے پوچھا کہ انشاء یہ کون شخص ہیں جس کی تمکنت نے اُٹھنے بھی نہ دیا ۔ عرض کی جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا تذکرہ حضور میں اکثر آیا ہے ، گذارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا ۔ سعادت علی خان نے خلعت بھیجی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا ، جب

---

(۱) آب حیات ۔ ص ۲۵۱ ۔ یہ یقین نہیں آتا کہ میر ایک نواب سے اس انداز سے کس طرح گفتگو کرسکتے ہیں ، معمولی معمولی زمیندار تک تو اس طرح کی باتیں برداشت نہیں کرسکتے ۔ پھر نواب نے ان کی یہ بات کیونکر برداشت کرلی اور ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے رہے ۔

چوبدار لے گیا میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا مسجد میں
بھجوائیے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں، سعادت علی خاں جواب
سن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا غرض نواب کے
حکم سے سید انشاء خلعت لے کر گئے اور سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر
بلکہ اہل و عیال پر رحم کیجئے۔ اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے اسے
قبول کیجئے۔ میر صاحب نے فرمایا حضرت۔ وہ اپنے ملک کے
بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں کوئی ناواقف اس
طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے
حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپیہ
کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ
قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی"۔ سید انشاء کی لفاظی
اور لسانی کے آگے کس کی بات پیش جاتی، میر صاحب نے
قبول فرمایا اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔" (۱)

لیکن خواجہ احمد فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ اس واقعہ کے بیان کرنے
میں آزاد سے غلطی ہوئی کیونکہ لکھنؤ میں ۱۸۰۰ء کے قریب انہوں نے سعادت
علی خاں کے یہاں ملازمت اختیار کر لی اور اس وقت تک بقول لطف
ان کی تنخواہ میں کمی نہیں آئی تھی۔

دہلی میں سب طرح کے مصائب برداشت کرنے کے بعد انہیں یہاں
پُرسکون فضا ملی تھی لیکن لکھنؤ کی پُرتکلف فضا ان کو راس نہ آسکی اور دہلی کو

---

(۱) آب حیات ص - ۲۶۵ - ۲۶۶

ہمیشہ لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ بقول خواجہ احمد فاروقی۔

"لکھنؤ میں انہیں جو جو قدریں ملی تھیں وہ سطحی تھیں یا معنوی۔ لکھنؤ کی تہذیب خوبصورت بھی تھی اور پر رونق بھی لیکن اس میں نہ گرمی تھی نہ گداز۔ اس کا حسن نظر کو تو فریب دے سکتا تھا لیکن دل کو نہیں۔ اس لئے وہ باوجود اہل لکھنؤ کی قدردانی کے دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ اجڑی ہوئی دلی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔"(۱)

ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے کس قدر حسرت ٹپک رہی ہے۔

خراب دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا   وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

ہوئی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری   نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

ایک جگہ صبا کے ہاتھوں دلی والوں کو پیغام بھجواتے ہیں۔ دیکھئے لہجہ کس قدر پرتاثیر اور درد انگیز ہے۔

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذر
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

خاک دلی سے جدا ہم کو کیا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

*

---

(۱) میر تقی میر۔ حیات اور شاعری۔ ص ۲۵۶۔

وفات اور تصانیف

میر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھنؤ کے ایک محلہ "سنعتی" میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہ اگرچہ اب ضعیف و نحیف ہو چکے تھے لیکن پھر بھی محتاج و معذور نہیں تھے۔ اپنے تمام کام خود ہی انجام دیتے تھے لیکن اس زمانے میں تین سال کے اندر تین اہم حادثات پیش آئے۔ سب سے پہلے ان کی لڑکی کا انتقال ہوا پھر لڑکے کا اور تیسرے سال انکی بیوی بھی چل بسیں، ان اچانک حادثات نے میر کے ہوش و حواس اڑا دیئے انہوں نے مشاعروں وغیرہ میں بھی شرکت چھوڑ دی اور اپنا زیادہ تر وقت گھر ہی میں صرف کرنے لگے، مندرجہ ذیل اشعار ان کی حالت کے آئینہ دار ہیں۔

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وہ شد و مد نہیں

کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

کر فکر اپنی طاقت فکری بھی ہے ضعیف
اب شعر و شاعری کی طرف کم لگا دماغ

میر جو چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میر
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے کئی بے دیگر حوادث نے انہیں اور بھی ضعیف و نحیف کر دیا تھا۔ قولنج اور گٹھیا کی شکایت پرانی تھی کمزوری میں اس نے زور پکڑا۔ کچھ پیٹ کی اور شکایتیں بھی رہنے لگیں۔ اس زمانے کے بڑے بڑے حکیموں نے ان کا علاج کیا، لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہو سکی۔ آخر کار ۲۰ شعبان المبارک ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں نوے سال کی عمر میں اس عظیم شاعر نے عالم فانی سے عالم آخرت کا سفر کیا۔ ندیم کر دن اکھاڑہ بھیم

کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔

واویلا مُرد شہ شاعران۔

(تصانیف)

(۱) کلیات نظم اردو۔ اس میں غزلیات کے چھ دیوان ہیں اور اس میں ہر صنف سخن کا حصہ علیحدہ ہے۔

نکات الشعراء۔ اس میں اردو کے قدیم شعراء کا تذکرہ ہے جو فارسی میں ہے اس کا سن تصنیف ۱۱۶۵ھ ہے، یہ ریختہ گویوں کا سب سے پہلا تذکرہ ہے، اس میں کیونکہ شعراء کی اچھائیوں کیساتھ ساتھ ان کی برائیوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے اس لئے اس کی تنقیدی حیثیت بھی ہے، نکات الشعراء سے ہمیں اس زمانے کی ادبی سرگرمیوں اہل علم کے آپسی تعلقات اور تہذیب و تمدن کے بارے میں بھی معلومات ہوتی ہیں، اس زمانے میں شہسواری شمشیر زنی وغیرہ کا عام رواج تھا اور اسے عوام کیساتھ ساتھ خواص بھی پسند کرتے تھے۔

میر نے اگرچہ اس کے لکھنے میں انصاف پسندی سے کام لیا ہے لیکن کہیں کہیں جذبات کی رو میں اعتدال سے ہٹ بھی گئے ہیں، لیکن بقول خواجہ احمد فاروقی "انہوں نے اگر ایک کعبہ گرایا ہے تو دوسرا بنایا بھی ہے" (۱)

(۳) ذکر میر۔ یہ بھی فارسی میں ہے، یہ میر کی اپنی آپ بیتی ہے، یہ تاریخی حیثیت سے بہت کار آمد ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں میر نے

---

(۱) میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۱۳۵۔

اپنے والد اور چچا کے حالات درج کئے ہیں، دوسرے حصے میں اپنی سرگزشت بیان کی ہے اور اپنے زمانے کے آنکھوں دیکھے حالات درج کئے ہیں، اس لئے دوسری تاریخی کتابوں سے زیادہ یہ کتاب مستند سمجھی جاتی ہے۔ کتاب کے سن تصنیف کے بارے میں اختلاف رائے ہے، قاضی عبدالودود صاحب کا بیان ہے کہ ۱۱۸۵ھ کے قریب لکھی جانی شروع کی گئی اور نثار احمد فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ انہوں نے یہ کتاب ۱۱۸۵ھ سے بہت پہلے لکھنا شروع کی۔ میر نے خود کتاب کے اختتام کی تاریخ اس طرح نکالی ہے۔

مسمی باسمی شد اے باہنر	کہ ایں نسخہ گردد بعالم سمر
نے تاریخ آگ شوی بے گمان	نزائی عدد بست دہفت از سران

لیکن کتاب میں غلام قادر روہیلہ وغیرہ کے حالات بھی درج ہیں جو اس سن کے بعد کے ہیں۔ نثار احمد صاحب کہتے ہیں کہ۔

اگر میرا قیاس صحیح ہے تو کتاب کا بیشتر حصہ (نسخہ مطبوعہ میں صفحہ ۱ سے ۱۲۰ تک) کامان میں قلمبند ہوا ہے محض چند صفحے (صفحہ ۱۲۱ سے ۱۰۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ میں۔"(۱)

(۴) فیض میر یہ مختصر سا فارسی رسالہ ہے جس کو انہوں نے اپنے صاحبزادہ فیض علی کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس کا بھی مسعود حسن رضوی نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس میں دو درویشوں کی پانچ حکایات ہیں، پروفیسر مسعود حسین رضوی صاحب نے فیض میر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ۔

---

(۱) میر کی آپ بیتی۔ ص۔ ۲۱

"میر کو فارسی زبان پر عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنہوں نے ذکر میر اور ان کا تذکرہ نکات الشعراء دیکھا ہے۔ میر کے ہم عصر بھی ان کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ بالعموم مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا، شاید کہیں کہیں تصنع آگیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے" (۱)

(۵) مجموعہ میراثی | یہ میر کا قلمی مجموعہ ہے جس کی ضخامت ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ پروفیسر مسعود حسین رضوی صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۶) دیوان فارسی | میر کا زیادہ تر کلام اردو میں ہے لیکن اس زمانے میں فارسی علمی زبان تھی، اس لئے انہوں نے فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ یہ ابھی مکمل طور پر طبع نہیں ہوا ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے یہ بھی مسعود حسن صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی اگرچہ ان کی مادری زبان نہ تھی لیکن اس کے باوجود انہیں اس زبان پر عبور حاصل تھا، فارسی دیوان میں بھی وہی مضامین نظم کئے گئے ہیں جو اردو میں موجود ہیں۔ مثلاً دنیا کی بے ثباتی عشقیہ مضامین اور اپنے ذاتی واقعات۔

(۷) مثنوی دریائے عشق | یہ میر کی ایک عشقیہ مثنوی ہے جسے انہوں نے نثر میں بھی لکھا ہے۔

---

(۱) میر نمبر از ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ص۔

میر کی زندگی اور شخصیت کا عکس انکی شاعری میں

مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔

"انسان کا طرز بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے، یہ معقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے، لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر آتا ہے، جو شخص میر کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود ان کے انداز ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا۔" (۱)

اب عبدالحق صاحب کے قول کے آئینہ میں ان کی شخصیت اور سیرت پر نظر ڈالئے، جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ میر ایک درویش کے بیٹے تھے ان کے والد ہمیشہ یہی نصیحت کرتے تھے کہ "بیٹا عشق اختیار کرو عشق ہی میں دل کھوتا اصل کمال ہے اور بے عشق زندگی وبال ہے" دیکھئے میر کے اشعار سے جا بجا اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

کون مقصد کو عشق بن پہونچا　　آرزو عشق مدعا ہے عشق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

---

(۱) افکار میر از عبدالحق ص ۱۹۶۔

محبت ہی اس کارخانے میں ہے　　محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

درویشوں اور بزرگوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے بچپن میں ہی تصوف نے ان پر اپنا رنگ جمالیا تھا۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو　　کام وہ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

عمر کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو　　بارے باندھے راہ کے ہی ہلو گوئی دم کھیچے

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ　　یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

منعم نے بنا ظلم کے رکھ گھر تو بنایا　　پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

انسان نے جو خدا اور بندے کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر رکھا ہے۔ میر اس کے قائل نہیں۔

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو　　اس پردے میں خیال تو کر ٹک کہ خدا ہو

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا　　نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر　　سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا۔

وہ جھوٹ بولنے کو ایک عظیم گناہ سمجھتے تھے انہیں اپنی بے دماغی کا احساس بھی تھا اس لئے وہ بغیر کسی جھجک کے اپنی بے دماغی کا اظہار بھی کر بیٹھتے ہیں۔

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ

از بس کہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

صحبت کسو سے رکھنے کا اسکو نہ تھا دماغ　　تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

دل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے　　گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے

وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے　　میں بے دماغ کرکے تغافل چلا گیا

تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے　　تیری چال ٹیڑھی تیری بات روکھی

میر کے یہاں کسی کے دل کو ٹھیس پہونچانا بھی گناہ ہے۔

کوئی ایسا گناہ اور نہیں　　یہ کہ کیجے ستم کسی پر یار

جی میں آوے سو کیجئے پیارے　　ایک ہونا نہ دریئے آزار

یہی درخواست پاس دل کا ہے　　نہیں روزہ نماز کچھ درکار

میر خود بھی بہت نازک مزاج تھے، بقول خواجہ احمد فاروقی میر شیشے کا دل لیکن پتھر کا جگر رکھتے تھے اس لئے وہ لاکھوں سختیاں جھیل سکتے تھے لیکن ایک کڑی بات نہ اٹھا سکتے تھے۔

اک ایک سخت بات پر برسوں اڑے رہے　　جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے

تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا　　ہم نیم جاں ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر

جنون اور چاک دامانی کے موضوعات اگرچہ عام ہیں لیکن میر نے ان فرسودہ مضامین میں بھی جان پیدا کر دی ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میر نے اپنی شاعری میں آفاقی غم کی مصوری کی ہے۔ ان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے وہ ایک زندہ دل شخص تھے لیکن حالات نے انہیں زندگی کی لطافتوں سے محروم کر دیا تھا، تاہم ان کی امیدیں سدا انسان کے روشن مستقبل ہی سے وابستہ رہیں۔

اب رنج و درد و غم کا پہنچا کام جاں تک — پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک
کس دن چمن میں یا رب ہوگی صبا گل افشاں — کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں۔

میر کا لہجہ نہایت مدہم ہے اکثر اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے۔ کوئی سرگوشیوں میں ہماری ہی داستان بیان کر رہا ہے۔

میر کی شاعری اس قدر غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے کہ اکثر لوگ انہیں قنوطی کہہ بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں، میر کے حالات ہمارے سامنے عیاں کر دیتے ہیں کہ ان کی تمام شاعری میں جو حزن و ملال پھیلا ہوا ہے وہ مایوسی کا اظہار نہیں بلکہ اس کیفیت کا اظہار ہے جو اس پُر آشوب زمانے میں ان پر گزرا لیکن اس کے باوجود انہوں نے انسان کی عظمت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا
آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا تو ولے قابل دیدار نہ تھا
میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں — اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہے

مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میر بھی زندگی سے لطف لینا جانتے تھے وہ بھی کسی دلفریب منظر کو دیکھ کر اس طرح خوش ہوتے تھے، جس طرح کوئی خوش حال انسان۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

بہار آئی شگوفے گل کے نکلے ہیں گلابی سے — نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

یوں باغ گل سے اپنے چھٹکے ہیں نہال باغ — جھک جھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یا ابیات
اخلاقی اشعار سے بھی ان کا کلام مملو ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا۔

...

خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار — ہے چوب خشک بو جو نہ ہووے اگر گرہ بیچ
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا۔

دھوکہ ہے تمام بحر دنیا — دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا
دنیا کی نہ کر تو خواستگاری — اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا

اگرچہ میر تنگدست تھے ان کی تمام زندگی مصائب کا سامنا کرتے گزری لیکن حرف شکایت کبھی زبان پر نہیں لائے اور فقر و فاقہ ہی پر خوش رہے۔

گو تو جو سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو — جاہ و ثروت کا میسر کوئی ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان نظر کم چشم عزیزاں نہ ہوا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میر معلوم ہے قلندر تھا۔

میر کو ان کے اکثر احباب یہ مشورہ دیتے تھے کہ بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہیں تاکہ کچھ فائدہ پہونچے اور زندگی خوشحال ہو لیکن میر اسے پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں — میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

میر کے یہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال اگرچہ کم ہے لیکن جہاں بھی ہے بہت خوب ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو اب ضرب المثل بن چکے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز — میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا
اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا
ضبط کروں میں کب تک آہ — چل اے خامے بسم اللہ
میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے
کرے کیا دل بھی تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے — سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
میرؔ ے تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے۔

❖

بابِ سوم

مثنوی کی تعریف اور مثنوی کا ارتقا

(میرؔ سے پہلے)

مثنوی عربی لفظ ہے جو مثنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دو دو کیا گیا کیوں کہ اس میں شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کے بعد قافیہ بدل جاتا ہے اس لئے ہم قافیہ مصرعوں کی مناسبت سے اس صنف کا نام مثنوی قرار دیا گیا۔ (۱)

---

(۱) فارسی شاعری میں مثنوی کے لئے سات بحریں مخصوص ہیں۔ اردو کیونکہ فارسی کے زیر اثر پروان چڑھی ہے اس لئے اردو شاعروں نے شاعری کی دوسری اصناف کی طرح مثنوی میں بھی انہیں سات بحروں کو اپنایا۔

پروفیسر گیان چند جین نے دریائے لطافت کے حوالے سے ان بحروں اور انکے اوزان کی نشاندہی اس طرح کی ہے۔

۱۔ سریع مسدس مطوی موقوف — مفتعلن مفتعلن فاعلات

۲۔ ہزج مسدس مقصور یا محذوف — مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

۳۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف — مفعول مفاعلن فعولن

اس کا دامن دوسرے اصناف سخن مثلاً قصیدہ مرثیہ غزل واسوخت اور ریختی وغیرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ مذکورہ بالا اصناف سخن میں جو پابندیاں ہیں وہ مثنوی میں نہیں ہیں، مثنوی میں انواع واقسام کے واردات قلبی کی قراروافی تصاویر ملتی ہیں۔ مولانا حالی کے الفاظ ہیں۔

(بقیہ حصے کا حاشیہ)

۴۔ خفیف مسدس مخبون مقطوع	فاعلاتن مفاعلن فعلن
۵۔ متقارب مثمن مقصور یا محذوف	فعولن فعولن فعولن فعول
۶۔ رمل مسدس مقصور یا محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
۷۔ رمل مسدس مخبون مقطوع	فاعلاتن فعلاتن فعلن

اردو میں ذیل کی بحروں میں بھی مثنویاں لکھی گئیں،

۸۔ متدارک مثمن مخبون	فعلن فعلن فعلن فعلن
۹۔ متقارب مثمن اثرم مقبوض	فعل فعولن فعل فعولن
۱۰۔ بحر متقارب مثمن اثلم	فعلن فعولن فعلن فعولن

آخری دو بحروں میں فارسی میں کوئی مشہور مثنوی نہیں لکھی گئی ان اوزان میں دوسرا تیسرا چوتھا اور پانچواں مقبول ترین ہیں۔

(اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۶۴-۶۵)

میر نے ان مروجہ بحروں میں سے عام طور پر مندرجہ ذیل بحروں میں مثنویاں کہی ہیں

۱۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض یا مقصور یا محذوف۔

۲۔ خفیف مسدس مخبون مقطوع (۳) متقارب مثمن مقصور یا محذوف

۴۔ رمل مسدس مقصور یا محذوف (۵) متدارک مثمن مخبون

(تلخیص از ڈاکٹر سید عقیل احمد)

"مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے۔ جتنی صنفیں فارسی و اردو شاعری میں ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔"(۱)

حالی کی طرح مولانا شبلی اور احسن مارہروی نے بھی مثنوی کی تعریف کی ہے۔ مثنوی میں بیان مربوط اور مسلسل ہوتا ہے اس کے برعکس دوسری اصناف سخن میں قافیہ بندی کی وجہ سے تسلسل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں چند صفحات کے بعد ایک باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اس طرح پوری داستان مختلف ابواب میں منقسم ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی مثنوی قصیدہ غزل اور مرثیہ وغیرہ سے ممتاز ہے، ایک ہی مثنوی میں حسن و عشق کی داستان، وعظ و پند، جنگ و جدل اور اسی طرح کی بہت سی باتیں سمو دی جاتی ہیں۔ اچھی مثنوی وہی سمجھی جاتی ہے جو زیادہ سے زیادہ کئی ہزار اور کم سے کم چار یا پانچ سو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین مثنوی کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ بات بھی نہیں کہ مثنوی بے عیب یا مکمل صنف سخن ہے اگر ایسا ہوتا تو آج اس کا زوال کیوں ہو گیا ہوتا۔ اگر مسدس کی خامی بار بار بند کی تبدیلی ہے تو مثنوی کی کمزوری اس کی لامتناہی یکسانیت ہے، کئی کئی ہزار اشعار کی مثنویاں ایک ہی

---

(۱) مقدمہ شعر و شاعری مع مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی ص ۳۱۵-۳۱۶

سلسلہ میں لکھی ہوتی ہیں لیکن طبع انسانی تنوع پسند ہے چنانچہ
علامہ اقبال نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ اپنی کتابوں میں مثنویوں
کو حسب مرضی بندوں میں تقسیم کر کے چھاپا لیکن یہ محض ایک خارجی
ترتیب تھی اسے مثنوی کی بنیادی ہیئت سے کوئی تعلق نہیں؟" (۱)

مثنوی کی ابتداء عموماً حمد و نعت سے ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ صحابہ اور ائمہ
کی منقبت اور بعض اس زمانے کے بادشاہوں اور ممدوح کا بیان کر کے
داستان کا آغاز کرتے ہیں۔ اس موقع پر بعض شعراء ساقی نامہ لکھنا پسند
کرتے ہیں جیسے میرحسن نے "سحرالبیان" میں داستان کا آغاز اس طرح کیا ہے:

پلا مجھ کو ساقی شراب سخن ۔۔۔ کہ مفتوح ہو جس سے باب سخن
سخن کی مجھے فکر دن رات ہے ۔۔۔ سخن ہی تو ہے اور کیا بات ہے

میر اور بعض دوسرے شعراء نے مختلف طرز اختیار کیا اور حمد و نعت
سے گریز کر کے اوصاف عشق سے داستان کا آغاز کرنے کو زیادہ پسند
کیا ورنہ حمد و نعت محض ایک رسم بن کر رہ گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر
شعراء نے رسماً صرف ایک شعر یا ایک مصرعہ میں ہی یہ حق ادا کر دیا ہے
مثلاً میر اثر نے صرف مندرجہ ذیل مصرعہ لکھ کر اپنی داستان کا آغاز کیا ہے

ع بعد حمد خدا و نعت رسول۔

اپنے زمانے کے رواج کے مطابق اکثر ہندو شعراء نے بھی اپنی
مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے کیا ہے جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے
کہ میر اپنی عشقیہ مثنویوں کا آغاز اوصاف عشق سے کرتے ہیں، یہاں بطور

---

(۱) اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ص ۵۹۔

نمونہ ان کی مثنوی شعلہ عشق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب محبت سبب ۔ محبت سے آتے ہیں کار عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی ۔ محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے ۔ محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

واقعہ نگاری خواہ وہ فطری ہو یا غیر فطری مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ مثنوی کی ایک اور خصوصیت بیان اور تشریح و توضیح ہے۔ مثنوی کی تیسری خصوصیت اس کا مقصد ہے۔ اس کو مثنوی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ایک عمارت میں اس کی بنیاد کو۔ مقصد کئی طرح کے ہو سکتے ہیں مثلاً اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور فلسفیانہ۔

مثنوی کے ذریعے عوام کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے غالباً اس کی اسی خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا حالی نے فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دی تھی۔

مثنوی کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱) اخلاقی جیسے مثنوی مولانا روم (۲) رزمیہ جیسے شاہنامہ، سکندرنامہ وغیرہ (۳) عشقیہ جیسے یوسف وزلیخا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔

گو مثنوی عربی کا لفظ ہے لیکن اس صنف میں عربوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ ان کے یہاں مثنوی کے بجائے نظم کے دوسرے اقسام موجود ہیں جن میں مثنوی کی طرح مسلسل واقعات بیان کئے جاتے ہیں اس لئے موضوع کے اعتبار سے علامہ شبلی نے رجز ہی کو مثنوی کا پیش خیمہ قرار دیا ہے کیونکہ اس میں بھی مثنوی کی طرح مسلسل واقعات بیان کئے جاتے ہیں

اور ہر شعر ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ (۱)

اس طرح مثنوی عربی کی نہیں بلکہ فارسی کی رہین منت ہے اہل فارس نے اس صنف میں بہت کام کیا اور مقبول ہوئے سب سے پہلے مثنوی کا جو نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ابو شکور بلخی کا ہے اس کے بعد رودکی ہے جس نے عربی کے مشہور و معروف قصہ "کلیلہ و دمنہ" کا ترجمہ مثنوی کی شکل میں کیا لیکن جو مکمل مثنوی ہمارے سامنے آتی ہے وہ فردوسی کا "شاہنامہ" ہے یہ ایک تاریخی رزمیہ ہے۔ اس سے اس زمانے کے تہذیب و تمدن جنگ کرنے کے طریقوں اور طرز حکومت وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں تہذیب کی ابتدا کرنے والا کیومرث تھا۔

---

(۱) اموی دور میں رویۃ العجاج کی رجزیہ نظمیں قابل ذکر ہیں، عباسی عہد میں رجزیہ نظمیں لکھنے میں عبداللہ ابن المعتز بہت مشہور ہیں جنہوں نے شکار نامے رجزیہ انداز میں لکھے ہیں۔

کیونکہ عربی میں صنف مثنوی نہیں ہے اس لئے عرب میں طویل نظموں کا رواج بھی نہیں رہا۔ حسان الہند غلام علی آزاد بلگرامی نے ایک مثنوی "مظہر البرکات" عربی میں لکھی اس کے دیباچہ میں انھوں نے عربوں کی مثنوی نہ لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عربی میں تین مختصر مثنویاں موجود ہیں۔ جنکے نام یہ ہیں (۱) "الصادح والباغم" جسے مصنف ابو یعلی محمد بن الہباریۃ العباسی ہیں دوسری مثنوی "ریاض الارواح" ہے جسکے مصنف شیخ بہاءالدین عاملی ہیں۔ انہوں نے ہی ایک تیسری مثنوی جس کا نام "سوانح الحجاز" ہے لکھی۔

تاریخ مثنویات اردو از جلال الدین جعفری ص ۲۔

اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ۔

چنیں است رستم سوائے فریب | گہے بر فراز و گہے بر نشیب
چنیں بود نا بود گرداں سپہر | گہے جنگ زہر است و گہ نوش مہر (۱)

فردوسی کا ہم عصر عنصری بھی مثنوی نگار شاعر ہے، اس نے یوسف زلیخا کے جواب میں ایک مثنوی "وامق و عذرا" نامی لکھی ۔ اسی طرح رومانی مثنویوں میں "لیلیٰ مجنوں" "خسرو شیریں" اور "ہفت پیکر" بھی لکھی گئیں ہیں اور بہت مقبول ہوئیں، رزمیہ مثنویوں میں نظامی کی مثنوی "سکندر نامہ" اخلاقی اور صوفیانہ مثنویوں میں مولانا روم عراقی سعدی اور اوحدی وغیرہ کی مثنویاں بھی قابل ذکر ہیں ۔

جب ہندوستان میں مغل سلطنت قائم ہوئی تو دور دور سے شعراء آنے لگے مغل بادشاہ شعر و ادب کے بڑے دلدادہ تھے، اس سے پہلے امیر خسرو ہندوستان میں فارسی شاعری کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ ان کی مثنویاں "نوسپہر" اور قران السعدین" بہت مشہور ہیں،

ایرانی شعراء کی آمد سے فارسی شاعری کو اور بھی فروغ حاصل ہوا، چنانچہ ایرانی شعراء کی مثنویوں کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی شعراء نے مثنویاں لکھیں، (۲)

---

(۱) شعر العجم جلد چہارم از مولانا شبلی ۔ ص ۲۵۶

(۲) اس سلسلہ میں فیضی کی وہ پانچ مثنویاں بہت مشہور ہیں جو اس نے نظامی کی تقلید میں لکھی تھیں ۔

(۱) نل دمن (۲) مرکز ادوار (۳) سلیمان اور بلقیس (۴) ہفت کشور

مثنوی کا ارتقا دکن میں

اردو کا آغاز اگرچہ شمالی ہند میں ہوا لیکن پروان دکن ہی میں چڑھی دکن کی سب سے پہلی تصنیف نظامی کی "کدم راؤ پدم" ہے۔ جو مثنوی کی شکل میں ہے۔ یہ قدیم دکنی زبان میں ہے، کدم راؤ پدم عشقیہ مثنوی ہے۔ کدم اور پدم اس کے ہیرو ہیں۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے شعراء کو اپنی مقامی تہذیب اور اس کے فطری ماحول سے گہری دلچسپی تھی۔ اس لئے انھوں نے لوک کتھاؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا تھا، نظامی سلطان احمد شاہ ثالث کے دور کا شاعر ہے۔ اور کیونکہ احمد شاہ کا دور ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک ہے۔ اس لئے مثنوی بھی اسی عہد کی تصنیف ہے۔ اس کا بالکل صحیح سن تصنیف ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا، اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

(بقیہ حاشیہ ص۶۴ کا) (۵) اکبر اسعد اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں از ڈاکٹر سید محمد عقیل احمد ص (۲)
فارسی کی طرح ہندی میں بھی مثنویاں بہت مقبول ہیں لیکن اس صنف کا ان کے یہاں کوئی مخصوص نام نہیں ہے۔ ہندی کی مشہور مثنویاں مندرجہ ذیل ہیں۔
چندر بردائی کا پرتھوی راج راسو قطبن کی مرگاوتی — جائسی کی پدماوت —
تلسی داس کی رام چرتر مانس — کیشو داس کی رام چندریکا — نابھا داس کی بھگت مالا — عثمان کی چترا ولی — نور محمد کی اندراوتی — اور مہادیوی ورما کی میرا راجیہ وغیرہ۔
(گیان چند جین مثنوی تذکرہ صفحہ ۶۲)

کدم راؤ اکھین رن ونہ آدھر | کہ رہین بات سن بات ایک بت دھر
سنیا تھا کہ ناری دھری بہت چند | سو مین آج دیتیا تری جند بند
دہس جھند جب میں لنیا جگ میں | نی دلی کتے نہن ہوی پر بارک میں
سجات ایک ناگن کجات ایک سانپ | اسنکت دیتہی کہدیں لاتب ہانپ
جو کونار مجکولن کیا سوی راؤ | اسنکت کہ کبوں دیکھ سکوں اپنا و (۱)

چونکہ دکنی عہد میں اردو کا فروغ مذہبی بزرگوں ہی کا مرہون منت تھا، اس لئے دکن کی ابتدائی مثنویوں پر مذہبی رنگ کی آمیزش زیادہ ہے۔ (۲)

اس قسم کی مثنویوں میں خوب محمد چشتی گجراتی کی مثنوی "خوب ترنگ" بہت مشہور ہے جو ۹۸۶ھ کی تصنیف ہے اس میں اخلاق و تصوف کے نکات چھوٹے چھوٹے قصوں کے ذریعہ سمجھائے گئے ہیں۔ (۳) مندرجہ ذیل اشعار میں قلب کی صفائی کی وضاحت کی گئی ہے لیکن اشعار پیش کرنے سے پہلے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قصہ کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

---

(۱) دکن میں اردو مع اضافہ آندھرا میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص (۱۴)

(۲) ابتدائی مثنویوں میں اشرف کی "نو سرہار" فیروز بیدری کی "پرت نامہ" شاہ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کی مختصر مثنویاں قابل ذکر ہیں۔ (نصیر الدین ہاشمی متذکرہ)

(۳) خوب محمد چشتی کو خود اس کی زبان کے مشکل ہونے کا احساس تھا اس لئے انھوں نے "امواج خوبی" کے نام سے اس کی شرح بھی لکھ دی ہے۔ "خوب ترنگ" بہت مقبول ہوئی۔ اس کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ (ہاشمی متذکرہ)

چین میں مصوروں کا ایک بہت مشہور گروہ تھا کچھ دنوں بعد وہاں ویسے ہی مصوروں کی ایک اور جماعت آپہنچی، دونوں میں تصادم ہوا۔ چنانچہ بادشاہ نے انھیں حکم دیا کہ دونوں جماعتیں دو دیواروں پر نقش بنائیں لیکن کوئی ایک دوسرے کو نہ دیکھے۔ اس لئے ایک ہال میں پردہ ڈال کر باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ چین کا گروہ تو باکمال تھا ہی۔ اس نے بہت محنت اور مشقت سے ایسے نقش و نگار دیوار پر بنائے کہ سب کے سب فطری معلوم ہونے لگے۔ جب مخالف گروہ کو معلوم ہوا کہ انھوں نے سب ہی رنگ استعمال کر لئے ہیں تو اس نے تمام تر توجہ دیوار کو صاف کرنے پر صرف کردی اور جلد ہی دیوار اتنی صاف کرلی کہ آئینہ کی طرح چمکنے لگی۔

بادشاہ نے پہلے چینی جماعت کے کام کا مشاہدہ کیا، پھر دوسری جماعت کے پاس آیا تو بے حد متعجب ہوا، کیونکہ بالکل ویسی ہی تصویریں یہاں موجود تھیں۔ اب نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چین مہین چتاری جان — چتریں مور تو اُٹھنے آن
تہنہ کتیک چتار دل اور — دعویٰ کیا سو آنس ٹھور
کہیا بادشاہ کن چل جائیں — لکھ پاتی پر نقش دکھائیں
گئے سلطان کنے سب چل — آسلطانیں دیا محل (۱)

کچھ عرصہ بعد جب سولہویں صدی کی ابتدا میں بہمنی سلطنت پر زوال آگیا اور سلطنت بہمنی پانچ ریاستوں (احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء (از عبدالقادر سروری ص ۲۷)

برار اور بیدر) میں تقسیم ہوگئی تو شاعری پیشہ ور درباری شعراء کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ ان ریاستوں میں خصوصاً بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمران شعر و ادب سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے شعراء کی بڑی دلدہی سے سرپرستی کی اس لئے اس عہد میں شاعری نے خوب ترقی کی۔ قطب شاہ کے درباری شعراء میں وجہی قابل ذکر ہیں جنہوں نے نثر میں "سب رس" نظم میں مثنوی "قطب مشتری" لکھ کر شہرت دوام حاصل کرلی۔ مثنوی قطب مشتری میں بھی سب رس کی طرح تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

شاعرانہ چشمکیں ہر دور میں چلتی رہی ہیں۔ پھر وجہی نازک مزاج بھی تھے۔ اس لئے قطب مشتری میں جا بجا انھوں نے اپنے عہد کے نوجوان شعراء پر طنز کے نشتر لگائے ہیں۔

کتا ہوں تجھے پند کی ایک بات	کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولیں تو بتیاں چیس	بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیری باتیں	پڑیا جائے کیوں جز مکر بات میں
جسے بات کے ربط کا نام نہیں	اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نہیں
نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس	اگر خوب بولے تو یک بیت بس (۱)

وجہی کی مثنوی کے بعد عشقیہ مثنویوں میں احمد کی لیلیٰ مجنوں قابل ذکر ہے یہ بھی محمد قلی کے زمانے کے شاعر ہیں۔ حسن شوقی بھی اس زمانہ کا شاعر ہے جس کی دو مثنویاں (۱) ظفرنامہ نظام شاہ (۲) میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ۔

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء (از عبدالقادر سروری ص ۔ ۷۲)

(۲) حافظ محمود شیرانی نے اپنی محققانی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ
(باقی حاشیہ صفحہ ۶۹ پر)

دوسری مثنوی سے اس زمانے کی تہذیب اور رسم و رواج وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ سلطان عبداللہ کے زمانے کا شاعر غواصی بھی قابل ذکر ہے۔ اس کی ۲ دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" بہت مشہور ہیں۔ اس کی ایک اور تیسری مثنوی "میناستونتی" بھی کسی قدر دلچسپ ہے۔ (۱)

غواصی کا ہم عصر ابن نشاطی ایک اچھا انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شاعر بھی ہے۔ شاعری میں مثنوی "پھول بن" اس کی شہرت کا باعث بنی۔ یہ فارسی مثنوی "البساطین" سے ماخوذ ہے۔ اس میں شاعر نے کہیں کہیں اپنا زور طبع بھی دکھایا ہے۔ اس لئے ہمیں اس عہد کی تہذیب اور طرز معاشرت کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے ایک شاعر جنیدی بھی ہیں جن کی ۲ دو مثنویاں "ماہ پیکر" اور "قصہ ابوشحمہ" قابل ذکر ہیں۔ ہم دکنی مثنویوں میں طبعی کی "بہرام و گل اندام" فائز کا قصہ رضوان شاہ" و روح افزا" اور غلام علی جس کے پدماوت کے اردو ترجمے کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مثنوی نگاروں میں مقیمی کا نام بھی سر فہرست ہے جو ابراہیم علی عادل شاہ کا شاعر ہے۔ اس کی دو مثنویاں بہت مشہور ہیں ۱۔ سوہار کی کہانی۔ ۲۔ چندر بدن مہیار۔ اس میں دوسری مثنوی کو بہت مقبولیت ہوئی۔ اس میں چندر بدن اور مہیار کا قصے کے مرکزی کردار ہیں۔ تزک آصفیہ سے

(بقیہ حاشیہ ص۶۸ کا) اس زمانے کے ایک اور شاعر عاجز نے بھی اپنی مثنوی اسلام میں لکھی ہے (اور اب اسے عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اپنے مقدمہ کے شائع کرا دیا ہے۔

(۱) عبدالقادر سروری متذکرہ۔

اس کے تاریخی ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔(۱) اس مثنوی کا قصہ میر کی عشقیہ مثنویوں سے مشابہ ہے۔

مقیمی کے عہد کا ایک اور شاعر امین ہے جس کی مثنوی "بہرام وحسن بانو" ہے۔ لیکن وہ اس کو تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ اس کے بعد دولت نے جو عادل شاہی عہد کا شاعر ہے۔ اس کی تکمیل کی۔

دکن کے بہترین مثنوی نگاروں میں صنعتی رستمی اور ملک خوشنود کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ تینوں محمد قلی کے زمانے کے شاعر ہیں۔ اس میں صنعتی کی مثنوی "قصہ بے نظیر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں حضرت ابو تمیم انصاری کی مہمات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۵۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی رستمی کی "خاور نامہ" ہے جس میں حضرت علیؓ کی مہمات بیان کی گئی ہیں اس کا زمانہ تصنیف ۱۰۵۹ھ ہے اور تیسری مثنوی ملک خوشنود کی .... "ہشت بہشت" ہے۔ اس کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا" بھی قابل ذکر ہے۔

نصرتی کا شمار بھی اچھے مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے جو علی عادل شاہ کا درباری شاعر ہے یہی وہ شاعر ہے جس نے مثنوی کو ڈرامائی رنگ بخشا۔ اس نے دو مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ایک "گلشنِ عشق" اور دوسری "علی نامہ" جو علی عادل شاہ مغلوں اور شیواجی کی مہمات پر مشتمل ہے۔

متصوفانہ مثنویوں میں ولی ویلوری کی مثنوی "روضۃ الشہدا" بہت مشہور ہے جو ملّا حسن واعظ کاشفی کی "دہ مجلس" کا ترجمہ ہے۔ اس میں امام حسن کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس نے اور بھی کئی مثنویاں مثلاً

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء از عبدالقادر سروری ص - ۵۷ -

مثلاً "روضۃ الانوار" "روضۃ العقبیٰ" اور "دعائے فاطمہ" لیکن اب
یہ نایاب ہیں۔

کروں نامہ کوں بسم اللہ سوں آغاز | اچھوں تا مَیں فصاحت میں سرفراز
سرادن کیا اسے جن یک سخن میں | بندایا جیو دم کے رشتہ سیبون بدن میں
کروں میں مجلس دردیم پر غم | وفات فاطمہ کر کر مُرقّم

اشرف کی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" بھی قابل ذکر ہے ۱۱۲۵ھ میں تصنیف
ہوئی۔ یہ فارسی کا ترجمہ ہے جو حضرت علیؓ کی جنگوں پر مشتمل ہے۔

خداوند اکبر ہے صاحب کریم | کہ جس کا محمدؐ ہے نائب مقیم
نہ مادر پدر اسکوں نانا رہے | دو جگ اور پیدا کر نہار ہے (۱)

محمود بحری کی "من لگن" اور وجدی کی "پنچھی باچھا" بھی صوفیانہ
مثنویوں میں اپنی مثال آپ ہیں۔ من لگن کا سن تصنیف ۱۱۱۲ھ ہے
یہ مثنوی بہت جلد خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔ چنانچہ ۱۱۱۵ھ میں بحری
نے "عروس و عرفان" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ "من لگن" کے
چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حضرت ہے کہے میں کیا فقیری | جب فقر کیا یو دستگیری
میری لبس عمرات سرس ہے | دو چار کم ایک سو برس ہے
اس عمر کوں فقر کے کیا پیش | درویش کیا تجھ ایک درویش
حاصل ہوے کے حق کے فضل سنگات | سو سال کے فقر میں یو دریافت (۲)

---

(۱) دکن میں اردو ص ۳۵۹

(۲) ایضاً ص ۳۳۳

وجدی کی "پنچھی باچھا" ۱۱۳۱ھ کی تصنیف ہے جسمیں اس نے فریدالدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" سے آزاد ترجمہ کیا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

واہ واہ اے ہدہد ہادی راہ — ہے تجھے معلوم کچھ وادی کی راہ
ہے سبا کے شہر پر تیرا گذر — کیا سلیمان کو دیا تو خوش خبر
تا تجھے ہے ساجداری ساز دار — جب سلیمان کا ہوا تو راز دار (۱)

"پنچھی باچھا" کے علاوہ ان کی دو اور مثنویاں "باغ جہاں فزا" اور "تحفۂ عاشقاں" بھی قابل ذکر ہیں۔

عشرتی کا شمار بھی بہترین مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس نے کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ جن میں سے اب صرف دو مکمل شکل میں ملتی ہیں۔ ایک "چیت لگن" اور دوسری "دیپک پتنگ"

"دیپک پتنگ" کے چند اشعار جو بطور تمہید ہیں یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

عجب ساز ہے ہند کا سوز ناک — کہ کرتا ہے نغمے سوں جیوں چال راکھ
ہندوستان ہے دل بول بتاں ال میں مست — کئی بات عاشقاں بت پرست
بری ہی برہمن بوجہاری ہر یک — تو ہے ہند میں بت پرستی ادب
بھریا ہند میں ٹھاٹ کو یوں جمال — کہ تس سامنے زہد و تقویٰ محال
جنگل سارا اس کا ہے جنت کے ناؤ — بیاض اس کا دستانین کا سواد (۲)

اس زمانے میں مثنوی نے ایک نیا روپ دھارا۔ فقہی مسائل کو قصوں کے انداز میں بیان کرکے حل کیا گیا ہے۔ اس قسم کے لکھنے والوں میں محمد علی عاجز

---

(۱) دکن میں اردو ص ۲۵۴

(۲) اردو مثنوی کا ارتقاء از عبدالقادر سروری ص ۸۸ - ۸۹

(مثنوی ملک مصر اور قصہ فیروز شاہ) شیخ داؤد علی ضعیفی (ہدایت ہندی) سید شاہ حسین ذوقی (وصال العاشقین) وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔

مثنوی کا ارتقار شمالی ہند میں عہد میر تک

دکن میں ایک عرصہ تک قیام کے بعد شعر و شاعری کا مرکز شمالی ہند میں منتقل ہو گیا۔ یہاں جو مثنویاں لکھی گئیں ان کی زبان دکن کی مثنویوں کی نسبت زیادہ صاف ہے۔ شمالی ہند میں جو سب سے پہلی مکمل مثنوی ہمارے سامنے آتی ہے وہ افضل کی "بکٹ کہانی" ہے) گو کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے پہلے بھی مثنویاں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں فرید الدین گنج شکر اور امیر خسرو کا نام اولین مثنوی نگاروں میں آتا ہے لیکن یہ بات مشتبہ ہے کیونکہ ان کی زبان اس قدر صاف ہے کہ اس زمانے کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس بارے میں عبد القادر سروری اپنی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقار" میں لکھتے ہیں۔

"ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ اکثر قدیم ترین اردو نظموں کے برخلاف اس کی بحر فارسی ہے اور فارسی بحریں اردو کے لئے عام طور پر دکن میں اردو شاعری کی کسی قدر ترقی پانے کے بعد سے استعمال ہونے لگیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ریختہ گو یعنی فارسی مصرعوں کے ساتھ ہندی ٹکڑے جوڑنے والے شاعروں مثلاً امیر خسرو وغیرہ نے فارسی بحریں بھی استعمال کی ہیں کہیں کہیں کوئی اردو غزل بھی فارسی بحر میں لکھ دی ہے لیکن مثنوی قطعہ اور بندوں کی شکل میں اور

نظم عموماً ہندی بحروں میں لکھی جاتی تھی۔" (۱)

اس مثنوی میں تین سو اشعار ہیں۔ یہ ایک فراق زدہ عورت کی داستان ہے۔ اور اس پر فارسی سے زیادہ ہندی اثرات غالب ہیں۔ افضل نے مثنوی کی ابتدا اس طرح کی ہے:-

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی | بھئی ہوں عشق کے غم سے دیوانی
تمامی لوگ مجھ بوری کہن رے | خرد گم کردہ مجنوں کہن رے
نہ مجھ کو بھوک دن نے نیند راتا | برہ کے درد سے سینہ براتا (۲)

(اس زمانے کی مذہبی مثنویوں میں) عبداللہ امین کی "فقہ ہندی" (۱۰۷۵ھ) محبوب عالم شیخ جیون کا "محشر نامہ" "درد نامہ" "خواب نامہ پیغمبر" ۔ اور "دہیر نامہ بی بی فاطمہ" اور اس طرح اسماعیل امروہوی کی دو مثنویاں قابل ذکر ہیں (۱) تولد نامہ بی بی فاطمہ اور (۲) قصہ معجزہ انار ۱۱۲۰ھ)

میر جعفر زٹلی بھی اس عہد کے شاعر ہیں، انھوں نے بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ جیسے "ظفر نامہ اورنگ زیب" در صفت پیری، طوطی نامہ، صفت جلوس اعظم شاہ بعد عالمگیر" اور سپس نامہ وغیرہ۔

لیکن شمالی ہند میں پہلے صاحب دیوان شاعر صدر الدین فائز ہیں۔ ہیں۔ جو اورنگ زیب کے ہم عصر بھی ہیں۔ انھوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں) مثلاً تنبولن۔ در وصف بھینگرٹن۔ درگاہ قطب۔ تعریف جوگن۔ در در وصف کا تجھن۔ ہولی اور پنگھٹ وغیرہ۔ فائز کی ان مثنویوں سے

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء از عبدالقادر سروری ص ۲۴-۲۵۔

(۲) اردو مثنوی شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۶۱-۱۶۲

ان کے زمانے کی تہذیب اور معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔)

(پھر ولی کی دلی میں آمد سے شاعری پر ہندی اثرات کا غلبہ کم ہونے لگا۔ اور فارسی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ ولی کے بعد کے شعرا نے ان کی پوری طرح پیروی کی اور انھیں کی مثنویوں کو اپنا نمونہ قرار دیا۔(۱)

شاہ حاتم کی پانچ مثنویاں ملتی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) مثنوی سراپا۔ (۲) ساقی نامہ (۳) وصف قہوہ (۴) وصف تمباکو و حقہ (۵) مثنوی بہاریہ مسمیٰ بہ بزم عشرت۔

افضل کی "بکٹ کہانی" کے اشعار سے ہندی اثرات کی وضاحت ہوتی ہے۔ اب ذرا فارسی کی آمیزش بھی دیکھیے۔

جہاں دیکھو تہاں ہے آن قہوہ	ہے بزم عیش کا سامان قہوہ
قبول بارگاہ بادشاہاں	جلوس دست صاحب سنگاہاں (وصف قہوہ)

محمد شاہ کے عہد میں کئی مثنویاں لکھی گئیں اور مقبول ہوئیں۔ ان میں فضائل علی خاں، جعفر علی خاں زکی، شاہ مبارک آبرو، شاہ آیت اللہ جوہری قابل ذکر ہیں۔ لیکن آیت اللہ جوہری کی مثنویاں بہار میں لکھی گئیں۔ اس لئے اس میں وہی قدیم رنگ غالب ہے۔

حیدر بخشی حیدری کی مثنویاں بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے اُردو زبان میں ایک شاہ نامہ لکھا۔ دکنی زبان کے مشہور قصّے "بہرام و گل اندام" کو نظم کیا اور نظامی کی ہفت پیکر کو بھی اردو میں لکھا لیکن ان سب مثنویوں سے زیادہ سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" نے شہرت حاصل کی۔ جو

---

(۱) یوں تو میر کی دو مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مگر نام ایک ہی بتایا گیا ہے۔ "در تعریف سورت"۔ البتہ دوسری مثنوی کو روحانی کیفیت کا مرقع بتلایا گیا ہے۔ سروری متذکرہ صفحہ ۹

سن ۱۱۶۰ھ میں لکھی گئی، جس کی زبان آج کی زبان کی طرح سلیس اور رواں ہے۔

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سیر — وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار — جدھر دیکھئے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا — تماشا تھا ہر مور کے شور کا (۱)

ان چھوٹی چھوٹی مثنویوں کے بعد مثنوی کا اصل دَور میر اور سودا سے شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں پرانی سادگی کو ختم کر کے مبالغہ کو اپنا شعار بنایا گیا۔ عشقیہ مثنویوں میں غزل کی چاشنی پیدا ہو گئی اور انھیں افسانوی رنگ میں ڈھالا گیا۔ ورنہ اس سے قبل مثنویاں ذاتی تجربات تک ہی محدود تھیں۔ عشقیہ مثنویوں کے علاوہ میر نے اپنی مثنویوں کو شکار ناموں، جانوروں کے حالات، بے ثباتی دنیا، ہولی اور ہجو، مدح کا ذریعہ بنایا۔ (۲) اس طرح سودا نے بھی اپنی مثنویوں میں ہجو، مدح اخلاق، خط و کتابت، موسم اور ادبی تنقید کو جگہ دی۔ سودا کی مثنویوں میں "پسر شیشہ گر و زرگر پسر" "ہجو پیلی راجہ نرپت سنگھ" "ہجو میر ضاحک، ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال" "ہجو امیر بخیل" "ہجو میاں فوقی" "ہجو طفل لکڑی باز" "بھنگی کی حکایت" "در منقبت" "تعریف شکار آصف الدولہ" "مثنوی در بارہ زن و شوہر" "معانی بیت مولانا روم اور "موسم گرما" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء از عبدالقادر سروری۔ ص ۱۰۱۔
(۲) میر کی مثنویات کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

گر گزک پر ہو میخواروں کا من | ہو رہے ہیں کباب مرغ چمن
ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک | نہیں شبنم یہ نکلی ہے چیچک
مہ کے پرتو کی کیا کروں تحریر | جو غش کھا جوں ابل چلے ہے شیر (موسم گرما)
ہے ہوا سے تنور چرخ یہ گرم | جو پڑے نان مہر ہو کر نرم (۱)

میر سے متاثر ہو کر راسخ عظیم آبادی، قائم چاند پوری، مصحفی صفا لکھنوی، بسمل فیض آبادی، مرزا علی لطف، اعظم الدولہ سرور دہلوی، جعفر علی خاں راغب، میر ضمیر، صادق اختر، طالب علی یاسین، شیخ عبدالرؤف، شعور اور مومن وغیرہ نے بھی مثنویاں لکھیں اور مقبول ہوئے۔ (۲)

---

(۱) اردو مثنوی شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۸۹۔
(۲) ایضاً ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔

بابِ چہارم

مثنویاتِ میر کا تہذیبی مطالعہ

ادب اور تہذیب

ادب اور تہذیب کا گہرا رشتہ ہے شاعری صرف دلی جذبات کی عکاسی ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔
"تہذیب نے فنون لطیفہ کو جنم دیا ہے۔ اور فنون لطیفہ نے تہذیب کی بقا اور ارتقا میں نمایاں طور پر حصہ لیا ہے اور انسانی ذہن کو خوب سے خوب تر کی تلاش پر مائل کیا ہے۔ فنون لطیفہ کی بدولت ایک عہد کی تہذیب دوسرے عہد کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ اور ایک دور کا انسان دوسرے دور کے انسان سے واقف ہو کر آگے بڑھا ہے اور ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے رشتے قائم ہوتے چلے گئے ہیں۔
شاعری بھی ایک فن لطیف ہے۔ اور اس فن کی وسعتوں اور رنگا رنگیوں کا یہ عالم ہے کہ اس میں فن تعمیر کا حسن تناسب فن بت گری کی حسن کاری، فن رقص کی کافر ادائی، فن موسیقی کی آتش نفسی سب ہی کچھ موجود ہے۔

جب وقت کا پردہ درمیان سے ہٹتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عہد کی شاعری میں اس عہد اور اس کے تمام فنونِ لطیفہ کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ (۱)

یوں تو ہم ادب کی دوسری اصناف میں بھی متعلقہ عہد کی تہذیبی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں اس عہد کی بھرپور رنگا رنگ تصویر نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں میر کی مثنویاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گو میر داخلیت پسند شاعر ہیں۔ لیکن ان کی مثنویوں میں اس عہد کے معاشرتی مسائل اور خارجی ماحول کا عکس پوری طرح نمایاں ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ہیگل کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ادب بھی تاریخ ہے جس میں کسی ملک یا قوم کے دَور بہ دَور بدلتے ہوئے تمدن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔ فنون لطیفہ بالخصوص کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں۔" (۲) اس قول کے مطابق میر کی مثنویوں میں اس کے عہد کے عروج و زوال کی پوری داستان بھی پوشیدہ ہے۔

میر کی عشقیہ مثنویاں

میر کے شعری کارناموں میں غزل کے بعد مثنویاں سب سے اہم ہیں، یہاں بھی ان کے کلام میں عشق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے میر کی عشقیہ مثنویاں

---

(۱) مثنوی سحر البیان کا تہذیبی مطالعہ از رضیہ سلطانہ (مقدمہ) ص ۶-۷۔

(۲) ادب اور زندگی۔ ص - ۲ -

توہیں۔ ان کے مطالعہ سے خصوصاً ان کے ابتدائی حصوں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے پختہ عمر کو پہنچ کر یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن اپنے جن عشقیہ واقعات کا ذکر کیا ہے وہ ان کی جوانی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔

میر کے یہاں تصور عشق جہاں انھیں نیرنگیٔ دنیا اور انقلاب روزگار اور ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔ اس میں اس زمانے کی سیاسی سماجی اور معاشی بدحالی کا صحت مند پہلو بھی ہے۔ جو نامساعد حالات میں جینے کا حوصلہ بخشتا ہے اور مذہبی سماجی اور معاشی تفرقے کو مٹا کر غیر متعصب سماج کی تعمیر کی راہ دکھاتا ہے۔ اور یہ زاہد کے تقویٰ، صوفی کے صفائے قلب، دنیادار کے وسیلہ زندگی اور عاشق صادق کے مابین ایک رشتۂ اتحاد کا کام کرتا ہے۔

ان مثنویوں میں اس زمانے کے تصورات عشق اور معاملات عشق دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان مثنویوں کے ابتدائی حصہ میں عشق کے بارے میں جو تصورات پیش کئے گئے ہیں وہ اس زمانے میں عام زندگی اور افکار وخیالات پر تصوف کے گہرے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میر کا تصور عشق عالمگیر ہے کیونکہ وہ اپنے والد کی نصیحتوں پر عمل پیرا تھے جو انھیں ہمیشہ یہی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم نہ ہو پاتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے، جو کچھ ہے وہ عشق کا ظہور ہے۔ آگ میں سوزش اور پانی میں روانی عشق سے ہے، خاک میں عشق کا قرار ہے، اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی

ہوشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر عشق کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔ جنت عشق کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی سے زہد عرفان سے سچائی اور خلوص سے اشتیاق اور وجدان سے بھی بلند و بالاتر ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمان کی یہ گردش بھی عشق کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہونچنے کی دھن میں برابر سرگردان ہے۔" (۱)

میر پر اس نصیحت کا بہت گہرا اثر پڑا۔ بقول مجنوں گورکھپوری "میر کے دل کا خمیر عشق سے ہوا تھا اور یہی ان کی شاعری کا خمیر ہے۔ عشق ان کے لئے عمر بھر باعث فخر رہا ہے وہ عشق کے لئے ایک جگہ کس پندار کے ساتھ کہتے ہیں۔

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد　　ایسے پھر خانمان خراب کہاں

یہ تہذیب عشق ہی کا طفیل تھا کہ انہوں نے مصائب زندگی کے آگے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ عشق نے ان کو زندگی کا مرد میدان بنا دیا اور اسی نے ان کو اس قابل رکھا کہ وہ اپنے محسوسات و واردات کو ٹھنڈے دل سے بیان کر جائیں۔ یہ انہیں کا حوصلہ اور انہیں کا جگر تھا کہ اپنی حرماں نصیبی کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔" (۲)

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۲۳۔ ۲۴

(۲) نکات مجنوں ص ۲۴۔ ۲۵

ان کے نزدیک محبت کائنات کی تخلیق کا باعث ہے محبت ہی سبب اور سبب ہے ، تمام دنیا محبت سے معمور ہے ، اس کی بدولت دنیا کے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام ہوئے ہیں ، محبت ہی ہے جس نے عاشق کو بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کیا ہے ۔ اس کے باعث دل سوز سے ساز بنتا ہے ۔ عشق خدا ہے ۔ عشق کے علاوہ کچھ نہیں ۔ اس کی بدولت رسول آئے جن کا پیغام بھی عشق ہی تھا ۔ لیکن عشق کے باعث بڑی بڑی مصیبتیں بھی آتی ہیں ۔ یہ بادشاہ کو فقیر کرتا ہے ۔ وطن سے بے وطن کرتا ہے کبھی کبھی یہی خودکشی کا باعث بنتا ہے ۔

یہی عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی ان کی شاعری کا اصل محرک تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی اکثر عشقیہ مثنویوں کی ابتداء عشق کی تعریف سے کی ہے ۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی　　محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے　　محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے (شعلۂ عشق)
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ　　محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

⁂

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　ہر جگہ اس کی ایک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا　　کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا　　کہیں سر میں جنون ہو کے رہا (دریائے عشق)
کہیں رونا ہوا ندامت کا　　کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

⁂

گہہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہہ پتنگا چراغ کا پایا

واں چکیدن ہو جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق تھا جو رسول ہو آیا — ان نے پیغام عشق پہونچایا

عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمد کہیں علی ہے کہیں (معاملات عشق)

⁂

عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

عشق حاضر ہے عشق غائب ہے — عشق ہی مظہر عجائب ہے

⁂

عشق گل ہے عشق بلبل عشق بو — عشق ہے سرو چمن عشق آب جو

ہے کہیں پیدا کہیں ہے یہ حجاب — عشق سے لوگوں کے ہیں کیا کیا خطاب

یاں سے پیغمبر ہے لایا عشق کا — عشق کو پیغام آیا عشق کا

مسجد و منبر کئے تازہ بنا — واں امام پاک خود آکر بنا (مثنوی موہنا)

⁂

عشق کے اعجاز دیکھے رنگ رنگ — موم دے دل ہو گئے جو دل تھے سنگ

آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا — عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا

گرمی ہنگامہ اس کی قہر ہے — پھونک دیوے گرد دیار و شہر ہے

میر کے یہاں عشق کے دو بنیادی تصور ہیں۔

(۱) فلسفیانہ یا روحانی (۲) مادی یا مجازی

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ذکر کر دیا جائے کہ خود تصوف

کیا ہے۔ اور اس نے اردو شاعری کو کیا دیا ہے۔

تصوف | تصوف کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔

(۱) تصوف تمام خواہشات کو ترک کردینے کا نام ہے۔

(۲) کائنات کو نہ صرف نظر حقارت سے دیکھے بلکہ اس کی طرف سے نظر ہی بند کرلے

(۳) تصوف کا وجدان کشف اور حس باطن کے ذریعے سے حقیقت دریافت کرنے کا نام ہے۔

(۴) صوفیاء کے تمام سلاسل خدا سے شروع ہوکر اسی پر ختم ہوجاتے ہیں۔ ان کے یہاں غیر اللہ کا مطلق کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی کا نام وحدت ہے۔

(۵) وحدت کے دو تصور ہیں۔

(۱) وحدۃ الوجود (۲) وحدۃ الشہود

وحدۃ الوجود کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے — لیکن وحدۃ الشہود کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ہر چیز میں خدا کا جلوہ ہے اور یہ لوگ عمل پر بھی زور دیتے ہیں۔

تصوف کو طریقت بھی کہا جاتا ہے اور شریعت و طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے کوئی سالک جو پابند شریعت نہیں اور عالم شریعت نہیں وہ صاحب طریقت بھی نہیں ہوسکتا۔ (۱)

اردو شاعری اور تصوّف | اردو شاعری کا تصوف سے تعلق بہت پرانا ہے۔ دکن میں قطب شاہ اور اس کے جانشین بھی تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں شمالی

---

(۱) دیوان خواجہ میر درد مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (مقدمہ) ص ۳۶۔

ہندوستان میں تو درد. میر درد اور میر وغیرہ نے بھی تصوف کو اپنا موضوع بنایا. جب تک اردو شاعری عشقِ حقیقی سے محروم رہی اس میں سوز و گداز بھی نہ تھا. تصوف نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، اور خاص و عام اس کے سوز و گداز خلوص و اخلاق کی تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے. جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے کی شاعری کو بڑی حد تک عریانی اور ابتذال سے نجات مل گئی۔ اور اس طرح سماج پر بہت اچھا اثر پڑا. اور یہ تصور عام ہو گیا کہ "عشق ہی راہ معرفت تک پہونچاتا ہے. عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے. عشقِ مجازی سے انسان توکل صبر و رضا ترک ہوس اور ایثار سیکھتا ہے. نفس کشی اور نفی خودی مقصود ہے. قطرہ کا انتہائی عروج یہی ہے کہ وہ دریا میں ضم ہو کر دریا ہو جائے. یہی مقصد حیات ہے اس لئے فنا مقصود ہے۔ اور یہی بقا کا راستہ ہے. اس لئے زندگی فراق ہے اور موت وصال ہے۔ خواہشات کو کچلنا اور وصال کو قریب لانے والا غم عین کامرانی ہے اور مادی خوشی انبساط روحانی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ (۱)

میر کے زمانے میں جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے دہلی انتشار کے دور سے گذر رہی تھی۔ وہاں کے عوام پر ان حالات کا گہرا اثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء کے ذہن متصوفانہ خیالات سے مملو تھے اسلئے روحانی عشق کا تصور عام تھا اور تصوف ہی کا اثر تھا کہ سوز و گداز خلوص شائستگی

---

(۱) دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر
از ڈاکٹر محمد حسن ص ۲۰۵۔

متانت اور سنجیدگی اس دور کی معاشرت کے خصائص تھے۔ مجازی عشق کا بیان ملتا ہے لیکن اعلا اور ارفع سطح پر۔ اس میں پستی ابتذال یا رکاکت نہیں۔ میر کے ہاں جس عشق کا بیان ملتا ہے وہ لازمۂ بشریت ہے اور غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے۔

مجازی عشق اگرچہ صحت مند عشق کا اظہار کرتا ہے، جس کا تعلق جنس مخالف سے ہے۔ ان کے یہاں برقعہ پوش خواتین کے ساتھ ساتھ ایسی مستورات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو بظاہر پردہ نشیں نہیں معلوم ہوتیں۔ غالباً وہ طوائفت کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ شک اس وقت یقین کی حدود کو چھو لیتا ہے جب ہم اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں کہ ہر طرف طوائفوں کا بازار گرم تھا اور کوئی بھی محفل بغیر ان کی موجودگی کے مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن عشق کے یہ تمام واقعات کچھ داستانی انداز میں بیان کئے گئے ہیں یعنی کسی کی ایک جھلک دیکھ کر ہی عاشق ہو جاتا اور عشق کا جلد ہی جنون کی حد تک پہونچ جاتا یہ ان کی مثنویات کے خاص موضوع ہیں۔

میر کی خود اپنی داستان بھی کچھ اس طرح کی ہے۔

یعنی میر اک خستۂ غم تھا	سر تا پا اندوہ دالم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جا گر	بے خود ہو گئی جان آ کر
صبر نے چاہی دل سے رخصت	تاب نے ڈھونڈھی کی دم فرصت
تاب و توان شکیب و تحمل	رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی	بیتابی نے طاقت پائی
خون جگر ہو بہنے لاگا	پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا	ایک گھڑی آرام نہ آیا

موڑے چھاتی تا بہ گریبا　　اور پلک خونتابہ گریا
دل میں تمنا داغ جگر میں　　شیون لب پر یاس نظر میں

لیکن اس طرح کے عشق کے بھی کچھ محرکات تھے ۔ میر کا عہد جاگیردارانہ نظام سے جکڑا ہوا تھا اور خاندان پر ایک فرد کی سرداری قائم تھی ۔ جو دیگر افراد خاندان کی نجی زندگی کے معاملات طے کرتا تھا اور شادی بیاہ کے تمام معاملات اس کی مرضی کے مطابق انجام پاتے تھے ۔ عورت یا مرد کو آزادانہ ربط و اختلاط کی پوری اجازت نہیں تھی ۔ خاندان ایک قبیلہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ بہت سے خاندان مل کر مشترکہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے اگرچہ آج بھی خاندان کے بزرگوں کو فوقیت حاصل ہے لیکن اس زمانے میں خاندان کے سربراہ کی بہت اہمیت تھی کیونکہ

"اس دور کے خاندان کی تنظیم اطاعت و انقیاد تقلید و اتباع کی بناء پر ہوئی تھی ۔ خاندان کا سربراہ نہ صرف اقتصادی اور معاشی زندگی کی ترتیب و تنظیم کا ذمہ دار تھا بلکہ خاندان کے سماجی وقار تہذیبی نہج اور نئی نسل کی فکری اور جذباتی تربیت کا بھی ذمہ دار تھا گویا وہ ایک سانچہ تھا جس میں سب کو ڈھل کر نکلتا تھا ۔ دھیرے دھیرے خاندان کے سربراہ کا اقتدار اور قبضہ اس قدر بڑھ گیا کہ یہ بات بھی باغیانہ سمجھی جانے لگی کہ لڑکے لڑکیاں خود اپنے طور پر شادی بیاہ کے معاملات میں کوئی فیصلہ کریں یا خود کوئی اپنا رفیق حیات منتخب کریں ۔ عام طور پر بزرگ خاندان کا فیصلہ بے چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا تھا لیکن جب بھی اس کے خلاف نوجوانوں نے اپنی

جذباتی آزادی اور رومانی خودمختاری کا علم بلند کیا ہے
خاندانی زندگی میں زبردست زلزلے آئے ہیں " (۱)
چنانچہ ان حالات میں جب کوئی شخص غرفہ کی جالیوں سے کسی کو جھانکتے
ہوئے یا غرفہ کی جالیوں سے کوئی نازنین سڑک پر کسی مرد رعنا کو گزرتے
ہوئے دیکھتی ہے تو وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ	تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی	پھر نہ آئی اسے خبر اس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی	وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ	صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی	تاب و طاقت نے بیوفائی کی
منہ جو اس کا طرف سے اس کے پھرا	مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

لیکن لڑکی نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ
وہ اس واقعہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے اس لئے ۔

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اٹھ گئی سامنے سے یک بارہ

ادھر نوجوان کی حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی گئی ۔
اور تھوڑے ہی عرصہ میں عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کر لی ۔ ابتداً میں
لوگ اسے بیمار سمجھ کر محبت و شفقت سے پیش آتے رہے لیکن رفتہ رفتہ جب
یہ راز سب پر آشکارا ہونے لگا کہ یہ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں تو یہ بات سب

---

(۱) دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر ص ۹۳-۹۴-۹۵

ہی کو ناگوار گزری ۔

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی　　ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اسکے بھی بدگمان ہوئے　　درپئے دشمنیٔ جاں ہوئے

سماج عشق بازی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سماج میں سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ خاندان کا بزرگ رشتوں کا انتخاب کرتا ہے ، یہی وجہ ہے کہ جب اس کا عشق جنون کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے تو سب کو بہت ہی ناگوار گزرتا ہے ۔ اس کو طرح طرح کی ایذائیں پہونچائی جاتی ہیں لیکن جب کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو لڑکی کو رسوائی سے بچانے کے لئے اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک دایہ کے ساتھ دوسری جگہ بھیج دیا جاتا ہے ، بات دور کی نہیں ہے اسلئے عاشق بھی بے خبر نہیں رہتا چنانچہ جب گھر سے محافہ روانہ ہوتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہو لیتا ہے لیکن عشق اس سماج میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اسلئے غدار دایہ اس کو فریب میں مبتلا کر کے ہمیشہ کیلئے اس داستان کا خاتمہ کر دیتی ہے

کھلم کھلا عشق کا اظہار بھی اس زمانے کی تہذیب کے خلاف تھا اور رسوائی کا باعث سمجھا جاتا تھا اس لئے دونوں عاشق و معشوق ضبط و تحمل سے کام لیتے تھے میر کی مثنویوں میں اسی طرح کے ضبط و تحمل کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں ، میر خود بھی ضبط و تحمل کے عادی تھے اور اس ضبط و تحمل کا نتیجہ تھا کہ ان پر ایک مرتبہ جنونی کیفیت بھی طاری ہو گئی تھی جس کا ذکر انہوں نے " مثنوی خواب و خیال " میں کیا ہے اور اپنی آپ بیتی میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ

" جس کوٹھری میں میں رہتا تھا اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اسی ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا ۔ چاند نکلتا تو میرے لئے قیامت ہوتی اگرچہ میں اس وقت سے چاند دیکھتا آیا تھا جب منھ دھلائے

وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا لیکن نہ اس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہونچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دور بھاگنے لگیں۔ چاندنی رات میں ایک حسین پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرہ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بیخود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رنگک پری پر پڑتی جس طرف دیکھتا اسی غیرت حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورق تصویر ہو گئے تھے یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کے سامنے، کبھی سیرگاہ دل میں محو خرام اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اس کی جدائی میں وحشت۔ جب سفیدہ سحر نمودار ہوتا دل سے ٹھنڈی آہیں نکلتیں یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف مچلتا۔ تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس (شکل مہتابی) کی یاد میں خون ہوتا میں دیوانہ دست کی مانند منھ میں کف بھرا ہوا ہاتھوں میں پتھر لئے گرتا پڑتا اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔

چار مہینہ تک وہ گل شب افروز نت نئے انداز دکھاتا اور اپنے نئے فتنہ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا۔ ناگاہ موسم بہار آیا تو جنون کے داغ اور بھی ہرے ہو گئے ــــــ میں ایسا ہو گیا جیسے کوئی آسیب زدہ ہو۔ اور مطلق کسی کام کاج کا

نہ رہا۔ وہ خیالی صورت ہمہ وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اس کی مشکین زلفوں کا دھیان سر میں۔ لوگ مجھ سے بھاگنے لگے اور مجھے بند کر دیا۔" (۱)

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"میر کو اپنے عہد جنون میں جو چہرہ مہتابی نظر آیا کرتا تھا وہ یقیناً اسی عورت کی تمثال رہا ہوگا جس کے ساتھ ان کو "میل خاطر" تھا۔ جس کے چلتے ان کو وطن چھوڑنا پڑا اور جس کی یاد میں عمر بھر وہ کھوئے رہے اور ایک غبار ناتواں کی طرح کو بہ کو، پھرتے رہے۔" (۲)

ان کی غزلوں کے بعض اشعار بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا ۔ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں ۔ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

⁂

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

⁂

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن ۔ شوق نے ہم کو بد حواس کیا

⁂

---

(۱) میر کی آپ بیتی ص ۹۴-۹۵
(۲) نکات مجنوں۔ ص۔ ۲۷۔

دل گیا رسوا ہوا آخر کو سودا ہو گیا
اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

جیسا اس سے قبل ذکر ہوا کہ اس زمانے کا ماحول آج کے عام ماحول سے مختلف تھا۔ معاشرے میں کافی پابندیاں تھیں۔ گو ایک جھلک دیکھ کر عشق ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس دنیا میں وصال ممکن ہو سکے گا۔ جسمانی طور پر تو پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں لیکن کسی کے خیالات پر پابندیاں عائد نہیں کی جا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا میں ضرور وصال ہوگا۔ انہیں اس بات پر یقین کامل تھا انہیں خیالات کا عکس ہمیں میر کی مثنویوں میں نظر آتا ہے کہ دنیا میں تو وہ نہیں مل سکتے لیکن موت انہیں ملا دیتی ہے اور یہ انجام دکھا کر میر عشق صادق کی بھی تصدیق کر دیتے ہیں۔" (۱)

ان حالات میں جب ناکامی مقدر ہو تو معیار عشق اور صداقت عشق ایثار کے بجائے ایک دوسرے کے لیے یاد میں جان دینا قرار پاتا ہے۔ چنانچہ میر کی ان مثنویوں میں ہیرو اور ہیروئن پانی میں ڈوب کر یا آگ میں جل کر خودکشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح جان دینا اس زمانے میں مقبول تھا اور عشق کے معاملات میں قیس و لیلیٰ، شیریں، فرہاد اور

---

(۱) کچھ اس قسم کے خیالات ہمیں قدیم یونانیوں اور رومیوں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مردوں کے ساتھ کھانے پینے کا سامان نوکر چاکر زیورات اور ملبوسات وغیرہ دفن کر دیتے تھے کہ دوسری دنیا میں انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہوگی۔

وامق و عذرا کے قصے نہ صرف مقبول اور مشہور ہوئے بلکہ اس زمانے کے عشقیہ معاملات میں ایک میزان کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور عشق میں ثابت قدم رہنا اور ایک دوسرے کو آزمانا خصوصاً مستورات کے معاملہ میں عام رجحان کی حیثیت رکھتا تھا۔

اگرچہ خاندان کے سردار کی مرضی کے آگے شریف خاندان کے لڑکے لڑکیاں سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔ اس طرح اکثر اوقات شادی یا تو دونوں کے ایک دوسرے کے دیکھے بغیر ہو جاتی تھی یا پھر اگر دیکھا بھی جاتا تھا تو اپنی پسند یا ناپسند کو دخل نہ تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات انجام بہت بھیانک اور خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں۔

"جاگیردارانہ دور کی تاریخ اس قسم کے لاتعداد ناکام رومانوں سے بھری پڑی ہے جو نسل اور رنگ خون اور خاندان کی نجابت اقتصادی یا طبقاتی تعصبات کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئے اور اپنے ساتھ نہ صرف نوجوان جوڑوں کی زندگی کو چکنا چور کر گئے بلکہ اپنے دور کو اس طرح متلاطم کر گئے کہ اس کی لہریں آج بھی نوجوانوں کے دلوں کو بے قرار کرتی ہیں۔ قیس و لیلیٰ، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں سسی پنوں اس قسم کے لاتعداد رومان ہماری روایت کا جزو بن چکے ہیں۔" (۱)

میر کی عشقیہ مثنویاں بھی اس دور کی صحیح عکاسی کرتی ہیں، پروفیسر ڈاکٹر

---

(۱) دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر۔ ص ۹۰۔

گیان چند کا خیال ہے کہ۔

"میر کی کئی مثنویوں میں ہیرو کسی منکوحہ عورت سے عشق کرتا ہے
مثلاً "جوان و عروس" "عشق افغان پسر" اور "مود نامہ"
میں۔ نازنین بھی ہیرو کی چاہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور وفا
کے ثبوت میں جان قربان کر دیتی ہے۔ گویا میر کے نزدیک
یہ مستحسن ہے کہ کتخدا عورت شوہر سے خیانت کرکے ایک نامحرم
سے عشق بازی کرے۔ انسانی سماج کی تنظیم خاندان کی بنا پر
کی گئی ہے، میر نے اپنی مثنویوں میں ازدواج پر دار کر کے
سماجی نظام ہی نہیں اخلاقی نظام کو بھی درہم برہم کر دیا ہے۔" (۱)

لیکن ہمارے خیال میں میر کی مثنویاں کیونکہ اس دور کی صحیح عکاسی کرتی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے اس سماج میں ایسا ہی ہوا اور اس کا سبب وہی ہے جس کا تذکرہ ہم نے اس سے قبل کیا ہے یعنی شادی کے معاملہ میں خاندان کے سربراہ کی زبردست مداخلت۔ اور اس کا کیا انجام ہوتا تھا اس کا عکس ہمیں میر کی مثنویوں میں نظر آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر کی کئی مثنویوں کے ہیرو کسی شادی شدہ عورت سے عشق کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مثنوی عشقیہ میں ہیرو مسلمان متقی، پرہیزگار اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے اور ہیروئن ہندو شادی شدہ ہے لیکن میر کے نزدیک محبت کے سلسلہ میں مذہب اور رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں ہے گو بدنامی کے ڈر سے دونوں کھل کر اظہار نہیں کرتے لیکن اندر ہی اندر محبت کی آگ میں سلگتے رہتے ہیں۔ اچانک عورت کا شوہر دق میں

---

(۱) میر نمبر دلی کالج میگزین۔ ص ۲۷۱۔

مبتلا ہو گیا اور ختم ہو گیا عورت اپنے مذہب کے دستور کے مطابق ستی ہونے کے لئے جاتی ہے جب اس کے عاشق کو اطلاع ملتی ہے تو وہ اس کو بچانے کیلئے بے خوف وخطر آگ میں کود پڑتا ہے۔ لیکن بچا نہیں پاتا عورت جل کر خاک ہو جاتی ہے احباب ہیرو کو بچا لیتے ہیں وہ آرام کرنے کے بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے ایک درخت کے نیچے ٹھہرتا ہے وہیں وہ عورت آتی ہے اور اسے لے کر غائب ہو جاتی ہے۔

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام | نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام
خراماں چلی آتی ہے وہ پری | وہی ناز و عشوہ وہی دلبری
وہی صورت اسکی ہے جلوہ نما | وہی رنگ دروگل کا غیرت فزا
اسی طرز و انداز خوبی کیساتھ | اٹھایا اسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ
گئی اس طرف لے جدھر تھی چلی | نظر کرتے تھے وا تھی یہ سبھی
ولے ماہیت کا کسی کو خبر | کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر

اسی طرح میر کی عشقیہ تمثیل "مور نامہ"[1] میں مور رانی پر عاشق ہو جاتا ہے

---

[1] مور نامہ میر کی ایک عشقیہ تمثیل ہے جس میں راجہ رانی اور مور حسن و عشق کی بنیادی قوتوں کے رمز ہیں، جس میں مور عشق کی تجسیم ہے۔ رانی حسن ہے اور راجہ جسد۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ

وجہی کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد تمثیل نگاری کی روایت اپنے اصلی رنگ میں محمد حسین کی تصنیف نیرنگ خیال (۱۸۸۰ء) میں ظاہر ہوئی اس طرح گویا وجہی سے آزاد تک کا درمیانی حصہ اردو تمثیل نگاری کی تاریخ میں ایک خلا سا معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے

جو شادی شدہ ہے۔ وہ کسی جنگل سے بستی کی طرف آ نکلتا ہے رانی کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ رانی بھی اس کی محبت کو ٹھکرا نہیں پاتی گو وہ اس راز کو راجہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اس سماج میں عوام کو فرصت تھی اس لئے وہ ایسے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے، دوسرے وہ راجہ کے وفادار بھی رہنا چاہتے تھے اس لئے یہ بات انھوں نے کسی نہ کسی طرح راجہ تک پہونچا دی راجہ بھلا یہ بات کیسے برداشت کر سکتا تھا آخر کار وہ مور کو ختم کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن عشق کی سوزش سے مور اور اس کے ساتھ جنگل بھی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ خبر رانی تک پہنچتی ہے تو

پھر بڑھی جو آگ سب لشکر جلا — اور راجہ کا بھی ادھر گھر جلا
یعنی رانی نے سنی جب یہ خبر — آتش غم سے جلا اس کا جگر
کیا لگی دل کو کہ رانی جل گئی — خاک ہو کر خاک ہی میں رل گئی
عشق ہی کی ہیں یہ تانہ کاریاں — عشق نے پردے میں جا نیں ماریاں
عشق سے کیا میر اتنی گفتگو — خاک اڑا دی عشق نے ہر چار سو

درمیاں نہ کوہ نہ انبوہ ہے — رانی کا راجہ کا اب اندوہ ہے
طائر طاؤس حیواں اژدہے — سب کچھے کیا عشق کی کوئی کہے
یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ — باز ماندہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

(۱) بقول حامد حسن قادری: ’’اگر میر تقی میر کی مثنوی ”مور نامہ“ کے کرداروں کا غور سے تجزیہ کیا جائے اور ان کی تمثیلی معنویت پر توجہ کی جائے تو وجہی اور آزاد کی گمشدہ درمیانی کڑی بآسانی متعین کی جا سکتی ہے۔
(رسالہ ماہ نو کراچی ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۲-۲۳)

مثنوی "جوان و مردس" میں بھی لڑکی کی شادی طے ہے۔ وہ ایک قافلے
کے ساتھ شادی کی غرض سے آتی ہے اور ایک سرائے میں قیام کرتی ہے۔
وہیں ایک نوجوان کی اس پر نظر پڑتی ہے اور وہ اس کی خوبصورتی سے
متاثر ہو کر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لڑکی بھی اس سے محبت کرنے لگتی
ہے لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتی، کیونکہ یہ اس زمانے کی تہذیب کے خلاف
ہے۔ شادی کے دن قریب آجاتے ہیں۔ لڑکی کسی دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔
اس درمیان میں مہترانی نوجوان سے کہتی ہے کہ تمہارا حجرہ بہت گندہ ہے تم
اس حجرہ میں چلے جاؤ جس میں وہ نازنین رہتی ہے، تاکہ میں کمرہ صاف کردوں
نوجوان نازنین کے کمرہ میں جاتا ہے وہاں وہ دیوار پر وہ نقش دیکھتا ہے
جو اس نے مہندی لگا کر دیوار پر بنائے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی یاد تازہ ہو جاتی
وہ اس کی جدائی کو برداشت نہیں کرپاتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ ادھر لڑکی شادی
کے بعد شوہر کے ساتھ آتی ہے تو اس سرائے میں قیام کرتی ہے یہاں وہ اس
نوجوان کو نہ دیکھ کر پریشان ہوتی ہے۔ مہترانی سے معلوم کرنے پر کہ اس کا انتقال
ہو گیا ہے اس کی حالت بہت خراب ہوتی ہے وہ مہترانی کو لے کر اس کی قبر
پر جاتی ہے جوں ہی وہ وہاں پہنچتی ہے قبر شق ہو جاتی ہے لڑکی اندر جاتی
ہے اور قبر بند ہو جاتی ہے۔

اس طرح دنیا میں تو وہ سماج کے اصولوں کو نہیں توڑ سکے لیکن موت
نے انہیں ملا دیا۔ اور بقول ڈاکٹر محمد حسن۔

"جاگیردارانہ نظام نے افراد خاندان کی ذہنی اور جذباتی
زندگی کی باگ ڈور میر خاندان کے ہاتھوں میں سونپ دی
تھی۔ اس کے خلاف بغاوت اور فطری آزادی کے لئے آواز

پابند کرنے کے لئے بھی یہی نظریہ موزوں تھا کہ حقیقت کا ایک روپ نہیں ہے اور محض عقل کے ذریعہ کوئی شخص یا گروہ اس تک رسائی کا بلا شرکت غیرے دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس دور کی عشقیہ شاعری محض عیش و نشاط ہی کی مظہر نہیں ہے اس کا ایک حصہ یقیناً جاگیردارانہ سماج میں خاندان کے ناجائز اور غیر فطری استبداد کے خلاف فطری خواہشات اور آزادی کی خواہش کا مظہر ہے۔۔۔ عشق دراصل اس دور کے لئے خارج کی تسخیر کا ذریعہ تھا جو فتح انہیں میدان عمل میں نصیب نہیں ہوتی تھی وہ عشق کے ذریعہ داخلی دنیا میں حاصل کرلیتے تھے۔ اس دور کے لئے عشق زمانے کی چیرہ دستیوں کا داخلی انتقام ہے۔ زمانہ انہیں نظرانداز کرتا تھا۔ عشق کی سرمستیوں میں کھو کر وہ زمانے کو نظر انداز کرتے یا اس کے نشاط و کیف سے بے پرواہ ہوکر زندگی گزارنے کا ہنر سیکھتے تھے۔" (۱)

میر کی مثنویوں کے پلاٹ مختصر ہیں طویل نہیں۔ اپنی مثنویوں کیلئے انہوں نے ایسے قصوں کا انتخاب کیا ہے جو ان کے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ ان عشقیہ مثنویوں میں بعض ان کی آپ بیتی میں شامل ہیں اور بعض جگ بیتی میں لیکن ان پر بھی ان کی آپ بیتی کا گہرا اثر ہے۔ اس طرح ان کی مثنویاں۔ میر حسن وغیرہ کی مثنویوں کی طرح "تخیلاتی" نہیں بلکہ ان کی اپنی داستان معلوم

---

(۱) دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر ص ۳۱۸ تا ۳۲۰

ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کی مثنویوں میں سحر البیان اور گلزار نسیم کی طرح مافوق الفطرت عناصر کی فراوانی نہیں لیکن بعض میں انجام کے ساتھ ضرور کچھ محیر العقول باتیں شامل ہو گئی ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں عشق کا جذبہ بہت پاکیزہ ہے۔ وہ نرم اور پاکیزہ جذبات کو بیدار کرتا ہے لیکن عشق اس کے ساتھ ایک قوی جذبہ بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی مثنویوں میں ایسی محیر العقول باتیں پیش کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں سمجھتے۔ نثار احمد فاروقی کا خیال ہے کہ ــ یہ انجام میراثی کی مثنویوں کا نہیں بلکہ اردو کی قدیم داستانوں کا ایک عام انجام ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرد میں انقلابی قوت نہیں تھی یا وہ روایات کے حصار کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا تھا تو اس نے اپنی مجبور فطرت کی تسلی کے لئے یہ طریقہ فکر اختیار کیا تھا۔ جیسے مطلق العنان بادشاہوں کے سامنے بہت سے سماجی اور اخلاقی مسائل پر آزادی سے اظہار خیال کرنے کے مواقع نہیں تھے تو داناؤں نے یہ انداز اختیار کیا کہ جانوروں اور پرندوں کو کہانیوں کا بولتا ہوا کردار بنا دیا۔ اور اب ایک طوطا چڑیا ہر وہ بات آسانی سے کہہ گزرتے ہیں جسے کہنے کے لئے انسان کو جان کی امان مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح مثنویوں میں عشق کا جو آغاز و انجام پیش کیا جاتا ہے وہ وہ ایک ایسے معاشرے کے حالات سے عین مطابقت رکھتا ہے جہاں سوسائٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر ایک اپنے قبائلی یا مذہبی روایات میں اس طرح بندھا ہوا ہے جیسے زبان گرامر کے اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اس معاشرہ میں عشق اس طرح اپنے ماحول سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا کہ عاشق و معشوق مرنے کے بعد باہم پیوست

ہو جائیں اور انہیں ایک ہی قبر میں مجبوراً دفن کرنا پڑے ۔" (۱)

میر کی مثنویوں کے عنوانات

میر نے اپنے مثنویوں کے نام مثنوی کی مناسبت سے تجویز کیے ہیں ۔ مثلاً "دریائے عشق" سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں ضرور دریا کا کوئی واقعہ ہوگا۔ یا "شعلۂ شوق" میں شعلے سے متعلق ضرور کوئی بات ہوگی ۔ انہوں نے اپنی مثنویوں میں عاشق معشوق کا سراپا بھی بیان کیا ہے جو اس زمانے کے معیارِ حسن کا مظہر ہے ان کی مثنویاں زیادہ تر ہیرو کے کردار کے گرد گھومتی ہیں ۔ تمام مثنویوں کے کردار ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً دریائے عشق ۔ شعلۂ شوق اور مثنوی عشقیہ کے کردار ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں" دریائے عشق" کا ہیرو ایک خوبصورت ، درمنچلا نوجوان ہے ۔ اس کے برعکس ہیروئن ایک پردہ نشین اور سنجیدہ لڑکی ۔ "شعلۂ شوق" میں ہیرو خود اپنی بیوی کا عاشق ہے ۔ اس ہیرو پر دوسرا مرد بھی عاشق ہے ۔ "مثنوی عشقیہ" میں ہیرو مسلمان متقی پرہیزگار اور نماز روزے کا پابند ہے اور ہیروئن ایک شادی شدہ ہندو عورت ۔ اس طرح انہوں نے اپنی مثنویوں میں اس قسم کے کرداروں کو پیش کر کے عشق کی عظمت اور سچائی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ البتہ ان مثنویوں میں جو بات ہمیں مشترک نظر آتی ہے وہ بارائے ضبط اور عاشقانہ جذبات کی فراوانی ہے جو نسوانی کرداروں کی بنسبت مردانہ کرداروں میں زیادہ ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو عورت کے متعلق بے وفائی کا عام خیال ہے ، ہو سکتا ہے میر نے اپنی مثنویوں میں

---

(۱) ملاقی میر (میر کی مثنویاں) ص ۲۱۳ ، ۲۱۴

اس خیال کے تحت عورت کے کردار میں یہ عنصر کم کر دیا ہو لیکن اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو عورت اس زمانے میں مرد سے بھی زیادہ بے بس و مجبور تھی۔ ایک تو اس کی فطری شرم و حیا دوسرے سماج کی طرح طرح کی پابندیاں پھر وہ اس حال میں کیونکر وفاداری کا ثبوت دے سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح وفاداری کا ثبوت دیتی ہے، مثلاً جب "دریائے عشق" کا ہیرو پانی میں ڈوب جاتا ہے تو لڑکی پر اس طرح ڈوب جانے کا خاطر خواہ اثر ہوا لیکن اس کے ماحول کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ جو کچھ اس پر گزر رہی ہے وہ اس کا اظہار کر دے آخرکار اس نے دایہ کو واپسی کے لئے آمادہ کیا۔ جب کشتی روانہ ہوئی تو اس نے دایہ سے وہ مقام دیکھنے کی فرمائش کی جہاں وہ ناشاد محبت غرقِ آب ہوا تھا۔ دایہ اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی اور اس کو وہ جگہ بتا دی۔

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر گر پڑی قصد جان کر کر
کشتیِ عشق آخر اس تہہ کو لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو
جا ہم آغوش مردہ یار ہوئی تہہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی

اگرچہ خودکشی کا یہ طریقہ مستحسن نہیں ہے لیکن اس سماج میں وفاداری کا ثبوت دینا کسی اور طرح ممکن نہیں تھا۔

اسی طرح مثنوی "شعلۂ شوق" میں جب پرس رام کی شادی ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں بعد وہ اپنے پرانے عاشق سے سنتا ہے وہ اسکی (پرس رام) بے وفائی پر لعن طعن کرتا ہے لیکن جب پرس رام بتاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو کر اسے فراموش کر چکا ہے تو اسے بہت افسوس

ہوتا ہے وہ اس کی بیوی کی محبت کو مکر زنان پر محمول کرتا ہے اور اسکے کہنے سے پرس رام اپنی بیوی کا امتحان لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے، چنانچہ ایک شخص کے ذریعے یہ پیغام بھیجا جاتا ہے کہ پرس رام دریا میں غسل کرنے گیا تھا لیکن دریا کی موجوں نے اسے آدبوچا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگیا یہ خبر سنتے ہی۔

نگہ اک طرف در کے مایوس کی دم سرد کھینچا گیا ڈوب جی

وہی بے خودی رخصت جو گئی وہ اک دم کی گویا کہ مہمان تھی

گری ہو کے بے جان وہ دردمند ہوا شور نوحہ کا گھر سے بلند

موئی غم میں اس جملہ تن نازکے گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

پرس رام اس سانحہ کی تاب نہ لاسکا اس کی کیفیت دیوانوں کی سی ہوگئی لیکن کرتا کیا اسے آخر اپنے مذہب کے مطابق دریا پرلے جاکر نذر آتش کردیا۔ مگر حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ایک دن وہ دریا کی طرف جانکلا دریا پر ایک مچھیرا رہتا تھا اس نے وہاں وہ گفتگو سنی جو وہ اپنی بیوی سے کررہا تھا کہ روزانہ آسمان سے زمین کی طرف ایک شعلہ لپکتا ہے اور "پرس رام پرس رام" کہہ کر آواز دیتا ہے، چنانچہ پرس رام نے ایک شب اس دام دار (مچھیرا) اور دوستوں کے ساتھ دریا پر سیر کا ارادہ کیا۔ ابھی کشتی روانہ ہی ہوئی تھی کہ دیکھتا کیا ہے کہ ایک شعلہ آسمان سے زمین کی طرف لپکا اور بلند آواز سے پکارنے لگا "اے پرس رام تو کہاں ہے ذرا میری محبت کا انجام دیکھ جب میرے دل میں محبت کی آگ بھڑکتی ہے تو میں لب آب اتر آتا ہوں تاکہ میرے دل کی تپش کم ہوسکے" یہ سنتے ہی پرس رام کشتی سے کود پڑا اور بولا "میں ہی پرس رام ہوں اور

میں بھی تمہاری ہی طرح شب و روز جل رہا ہوں" تھوڑی دیر بعد پرس رام بھی اس شعلہ کے ساتھ غائب ہو گیا۔ سب نے اسے تلاش کیا لیکن کہیں سراغ نہ مل سکا۔

شعلہ کو پیش کر کے میر نے پرس رام کی بیوی کا تصور پیش کیا ہے جو اس زمانے میں عام تصور تھا کہ روحیں اپنے معشوق کی تلاش میں اس وقت تک سرگرداں رہتی ہیں جب تک معشوق اسی طرح جواب نہ دیدے یعنی وہ بھی ختم نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ شعلہ کو بطور علامت بھی استعمال کیا ہے کہ محبت کس طرح پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور ختم کر دیتی ہے۔

مثنوی "اعجاز عشق" میں بھی ہیروئن کی وفاداری کا پورا ثبوت موجود ہے، جب ہیرو کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ ہیروئن کا پیغام بھجواتا ہے، لیکن ہیروئن جب اس کو یہ جواب دیتی ہے کہ۔

کہ ہجراں میں جو بیقراری کرے سر راہ فریاد و زاری کرے
نہ سونے دے نالہ سے ہمسایہ کو بھلی مرگ ایسی فرو مایہ کو

جب یہ بات ہیرو سنتا ہے تو جاں بحق ہو جاتا ہے، پیغامبر اس کی موت کی خبر ہیروئن کو جا کر سناتا ہے یہ خبر سنتے ہی وہ بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اسے سچی محبت تھی لیکن وہ عشق کی رسوائی نہیں چاہتی تھی۔

یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحہ کی آنے لگی کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی

مردانہ کردار میں عاشقانہ جذبات کی فراوانی اور یارائے ضبط میں

کافی حد تک میر کی اپنی جذباتی کمزوریوں کو بھی دخل تھا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

"میر کے ہیرو مصائب جھیلنے میں طاق ہیں۔ عشق کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے، مگر مصائب عشق سے منہ بھی نہیں پھیرتے۔ دراصل ان کے کرداروں کے بھیس میں میر خود پارٹ ادا کرنے لگتے ہیں مگر اپنی ہستی کو اس قدر الگ کئے رہتے ہیں کہ اگر کوئی ان کی نام ناکس زندگی سے پہلے سے واقف نہ ہو تو اسے اس بات کا شبہ نہیں ہو سکتا کہ "دریائے عشق" یا "شعلہ شوق" کے ہیرو کے بھیس میں میر خود موجود ہیں۔" (۱)

میر کی عشقیہ مثنویوں میں اگرچہ اس زمانے کی معاشرت اور خارجی دنیا کے گہرے نقوش نظر نہیں آتے بلکہ داخلیت و جذبات اور احساسات کا اظہار ان کا خاص موضوع ہے جسے ناسازگار حالات اور انقلاب زمانہ اور بدامنی نیز معاشی بدحالی کا انفرادی ردعمل کہا جا سکتا ہے جو انہیں باہر کی دنیا کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بجائے اپنے باطن میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن اس میں ایسی عمومیت ہمہ گیریت اور ابدیت موجود ہے جس کے باعث یہ جذبات و احساسات کسی فرد واحد ہی کی ترجمان نہیں رہ جاتے بلکہ یہ اس زمانے کے عام انسانوں کے جذبات و خیالات اور احساسات بن جاتے ہیں۔

❊

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء۔ ۳۲۹

میر کی دیگر مثنویاں

عشقیہ مثنویوں کی طرح میر کی دوسری مثنویاں بھی اگرچہ یہ زیادہ طویل نہیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی مثنویوں سے اس زمانے کے سماج خود میر کے حالات زندگی ہتو اردں اور رسم و رواج کے متعلق کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں. پروفیسر زور کا خیال ہے کہ "اگر زمانہ میر کو بیرونی کائنات کے مطالعہ کا زیادہ موقع دیتا تو بہت ممکن تھا کہ ان کی شاعری میں خارجی حالات کی بھی اچھی سے اچھی تصویریں نظر آتیں (۱)۔" اور سید محمد کا خیال ہے کہ "ان کی مثنویاں ان کی زندگی کا ایک ایسا مرقع ہیں جن میں ان کے رہن سہن، دکھ درد سفر و حضر، سیر و تفریح کی تصویریں ہی نہیں ملتیں بلکہ ان کے مزاج کی خصوصیات اور افتاد طبع کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے ۔ میر کی مثنویاں ایک ایسا روشن آئینہ ہیں جس میں میر کی سیرت اور ان کی زندگی کے خد و خال بہت ہی صاف اور نمایاں نظر آتے ہیں ۔ ان کی مثنویاں گویا آپ بیتی ہیں جن کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔" (۲)

ان دونوں بزرگوں کی رائیں قابل احترام ہیں لیکن ہم ان مثنویوں کے پیش نظر یہ عرض کرنے کی جرأت ضرور کریں گے کہ خارجی کوائف کا جو بیان ان میں ملتا ہے وہ نہ صرف قابل اعتنا ہے بلکہ عشقیہ مثنویوں کے مقابلہ میں ان میں خارجی رنگ ہی کچھ زیادہ نمایاں ہے ۔ وضاحت کے لئے ان کا مطالعہ

---

(۱) تین شاعر انیس، میر اور ہوریس اسمتھ پر ایک تنقیدی نظر۔ ص ۱۴۱

(۲) دلی کالج میگزین۔ میر نمبر۔ میر اپنی مثنویوں کے آئینہ میں۔ ص ۲۷۵

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کیا جا سکتا ہے۔

(۱) رسم ورواج (۲) مشاغل (۳) ادبی روایات (۴) توہمات (۵) اخلاقی حالت (۶) سیاسی، سماجی اور معاشی حالات (۷) تصور حیات

(۱) رسم ورواج شادی سے متعلق شادیوں سے متعلق میر نے تین مثنویاں لکھی، ایک آصف الدولہ کی شادی کے موقع پر دوسری بشن سنگھ کی شادی کے موقع پر اور تیسری عہد سعادت علی خاں میں کسی شہزادے کی شادی کے موقع پر۔ اگرچہ انہوں نے عام شادیوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے لیکن ان مثنویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عام طبقہ کے لوگوں میں بھی اتنی دھوم دھام نہ سہی لیکن کم و بیش اسی قسم کی رسمیں رائج ہونگی میر کا زمانہ (لکھنؤ) فارغ البالی کا زمانہ تھا لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہ تھی، دولت کی ریل پیل تھی اس لئے جب بھی کسی امیر یا رئیس کے ہاں شادی ہوتی تو کئی دن پہلے سے شہر کی آرائش شروع ہو جاتی اور عین شادی کا دن تو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سلسلہ میں بہترین مثنویاں وہ ہیں جو انہوں نے آصف الدولہ اور بشن سنگھ کی شادی کے موقع پر لکھی ہیں۔
ان کی وہ مثنوی ملاحظہ کیجئے جسمیں انہوں نے آصف الدولہ کی شادی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ تفصیل اگرچہ سحر البیان کے مقابلہ میں نہ سہی پھر بھی اس سے اس زمانے کے رسم ورواج پر روشنی پڑتی ہے، عام شادیوں میں دھوم دھڑکا مچ جاتا ہے، پھر یہ تو ایک شاہی شادی تھی اور ایسے شخص کی جسکے باورچی خانہ پر عام دنوں میں سترہ سو روپیہ خرچ ہوتا تھا دیا اس زمانے کی بات ہے جب روپے کا چھپن سیر گیہوں ملتا تھا۔؎

اس موقع پر سارا شہر دلہن کی طرح سجایا گیا ہے، کاغذ کے رنگین

پھولوں سے شہر کو مزین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آتش بازی چھوڑی جارہی ہے ہر شخص اپنے دکھ درد بھول کر اس دلکش منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ہے جہان کہن تماشا گاہ — آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ
دل خوش احباب نثار پیرخ دھر — بستہ آئیں وہ دراستہ ہے شہر
نئے سرے جواں ہوا ہے جہاں — عیش و عشرت کے محو خورد وکلاں
ہر طرف شہر میں ہے آرائش — رہروان کی نہیں ہے گنجائش
کاغذیں باغ کا تماشا ہے — پھول کترا کہ گل تراشا ہے

آصف الدولہ کی شادی کا جلوس بہت شاندار ہے، ہاتھی اس طرح جھومتا ہوا آتا ہے جیسے ابر بہار۔ اس پر زر و جواہرات کی بارش ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں روسا اور بادشاہوں کے یہاں بارات ہاتھیوں پر نکلا کرتی تھی۔ گویا ہاتھیوں پر بارات جانا شان و شوکت کی نشانی سمجھا جاتا تھا سواری پر زر و جواہرات کی بارش کی جاتی تھی غالباً ایسا مذہبی جذبہ کے تحت کیا جاتا تھا جسے وہ صدقہ سمجھ کر نچھاور کرتے تھے۔

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم — جیسے ابر بہار آدے جھوم
آئے دولت سرا سے ہو کے سوار — لعل ناب و گہر ہیں صرف نثار

جلوس میں سب سے آگے ایک فیل نشان ہے۔ اس کی آرائش اور زری کی چمک دمک کی وجہ سے دور سے دیکھنے والے کو سونے کے پہاڑ کا شبہ ہوتا ہے۔ فیل نشان کے بعد ہاتھیوں کا ایک دستہ ہے جسے میر نے مست نوجوانوں سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے اس زمانے کے عام

نوجوانوں کی کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے ، جلوس کے ساتھ گھوڑسوار
کی پلٹنیں بھی ہیں ، اور ان سواروں کے گلوں میں پھولوں کے ہار پڑے
ہوتے ہیں -

اک مہابت کے ساتھ فیل نکلا آگے مانند کوہ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے جیسے آویں جوان مدھ ماتے
جلی زر ریفت کی ہے ساری شب روکش انجم فلک ہیں سب
پلٹنیں جاتی ہیں برابریوں صف ہو مژگان دلبراں کی جوں
خوش سواری و خوش جلو خوش راہ باگ اچکے تو پھر نہ ٹھہرے نگاہ
گردنوں میں پڑی حمائل گل ہے جلو میں بصد شمائل گل

جب دولہا گھر سے روانہ ہوتا ہے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار
ڈالے جاتے ۔ لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے ، جلوس پر اس کثرت
سے گل افشانی کرتے کہ زمین پر پھولوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا ۔

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل
رہ گذر میں ہیں رستہ رستہ گل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے ستارے توڑ کر جوڑ دیئے گئے
ہیں ، اس حسین موقع پر رؤسا کے علاوہ متوسط اور ادنیٰ طبقہ کے
لوگوں کو بھی شرکت کا موقع ملتا ۔ زری پوشوں ، ہاتھیوں تازی ، ترکی
عراقی اور عربی گھوڑوں کے علاوہ بارات میں مشاعروں کا جلوس بھی
ساتھ ہوتا جو مدح خوانی کرکے اپنی الگ ایک شان دکھاتا ہے ۔

کد خدا ہونے کو چلا دولہا بال گوپال عظم سے جوں شہہ
گل کی پاکھر پڑی ہوئی یکبار ہاتھی آیا برنگ ابر بہار

زری لوشوں کا پیش و پس انبوہ | اللہ اللہ رے اُنکی شان شکوہ
موتی گرتے تھے ہر طرف سے نثار | تھا مگر فیل ابر گوہر بار

(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

ہے جلو میں زینیاں حاضر | جاہ کی آسمانیاں حاضر
عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سیت | شاعران مدح خواں ہیں میرت
تازی، ترکی، عراقی و عربی | کوتل آگے تھے خوش جلو میں بھی

ایسے موقعوں پر آتش بازی کا عام رواج تھا۔ باڑ چھڑی، ہوائی جگنیاں، پھلجھڑیاں، ستارے، انار اور مہتابیوں کا استعمال کثرت سے کیا جاتا تھا۔

کیا ستاروں کا چھوٹنا کہیئے | آسماں کی طرف ہی تک رہیے
دو طرف چھوٹتے جو ہیں گے انار | راہ در ستے ہوئے ہیں باغ و بہار

(مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ)

توپیں کیا ڈھالی ہیں ستاروں کی | کھوئی رونق فلک کے تاروں کی
تارے موقوف کچھ سماں نہیں | توبیں چھوٹیں گر ہوا پہ نہیں
گنج چھوٹے ہیں یا کہ باڑ چھڑی | یا ہوائی ہے جگنیوں کی چھڑی
گل فشاں ہیں پڑی جو پھلجھڑیاں | کھلتیاں ہیں دلوں کی پھلجھڑیاں

(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

اس ضمن میں روشنیوں کا منظر بھی ملاحظہ کیجئے، آج کل تو رنگین بلب وغیرہ لگا کر اس قسم کی محفلوں کی رونق میں اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میر کے عہد میں بجلی تو تھی نہیں۔ اس لئے شمع دفانوس وغیرہ کا کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا اس شادی کے موقع پر اتنی کثرت سے چراغاں کیا گیا ہے

کہ زمین و آسمان کو رشک آتا ہے

گرم ہو جو دماغ انساں کا — لطف آ دے نظر چراغاں کا
جس طرف دیکھیئے چراغاں ہے — شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے
باغ سے روشنی ہوئی ہے زیاد — ہے یہ ہنگامہ تا جلال آباد

(مثنوی در جشن ہولی دکتخدائی)

شمع و فانوس کا بہت ہے ہجوم — شمعی رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم
تارے سے ہیں چراغ چار طرف — آسماں پر زمیں رکھے ہے شرف

٭

روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ — سیر میں گرم ہو گیا جامہ
گرمی سے مشعلوں کے آئے تنگ — دود مشعل ہے جا بجا ہی ترنگ
شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن — زرد پھولا ہے کاغذی گلشن

ایسے موقعوں پر سہانے گیت گائے جاتے ہیں، باجے گاجے کا عام رواج تھا اور نوبت نے جھانجھ اور نقارہ وغیرہ اس زمانے کے مشہور باجے تھے۔

نوبتی اب طبیعتوں کو رجھاؤ — چلی سواری کا ٹک اصول بجاؤ
چوب نقارے پر لگا اس ڈھب — کہ رکھیں گوش اس صدا پر سب
ایک دو دم بجائے سچا یوں نہیں — دلکش آواز گائے جا یوں نہیں

(مثنوی در بیان کدخدائی آصف الدولہ)

کہیں نوبت کو چل کے سنئے گا — نے کے بجنے پہ سر کو دھنئے گا
نوبتی خوش سلیقہ سارے ہیں — نے نقواروں نے جان مارے ہیں
آج نوبت کے بجنے پہ ہے ترنگ — عقل ہوتی ہے سن کے تھوری دنگ

جا بجھ کے سننے کی رہی جھانجھ   صبح جوں توں کلام کرے بیانجھ
(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

شادی کے موقع پر بادشاہ لوگوں کو زر و جواہرات اور قسم قسم کے ملبوسات اور خلعتوں سے بھی نوازتا تھا۔ ہر شخص کو اس کے مرتبہ کے مطابق زری بادلہ تاس اور خوبصورت دوشالہ عطا کرتا تھا۔

بحر بخشش کی لہریں اب آئیں   زر و جوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ   دیتے ہیں خلعت گرانمایہ
طرہ ہائے زری و بادلہ تاس   تحفہ ہائے دوشالہ تحفہ لباس
بہت ان میں سیے بہت نہ سیئے   ایک عالم کیں سبھوں کو بخش دیئے
خاص ملبوس نوع نوع تمام   لے گئے شاد ہو کے مردم عام
(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

زر و جواہرات اور پوشاکوں کی بخششوں کے علاوہ بادشاہ کی طرف سے کھانے کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور اس میں ہر طبقہ کے لوگ اپنی حرص کو سیر کرتے تھے۔ کھانے کے برتن عموماً سونے اور چاندی کے ہوتے تھے۔

کیا بچھا ہے فراخ دستر خوان   جس پہ ہے خلق یک جہاں مہمان
تورہ بندی ہوئی تکلف سے   کھانے نکلے نئے تصرف سے
لطف کے ساتھ نعمتوں کا وفور   زیر ہر جعبہ قاب ہے پر نور
عام تھا ان لطافتوں سے طعام   دیتے لیتے تھے ہر سحر ہر شام
کس کو اسباب یہ میسر ہیں   ظرف سیمیں جعبہ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا   حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

فراغت اور دولت کی زیادتی نے لوگوں میں عیش پسندی کو عام
کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے موقع پر بھی رقص و شراب نوشی عام تھی۔

آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب — سب مہیا ہیں عیش کے اسباب
لا وہ جوں آفتاب ساغر زر — آب گل رنگ سے لبالب کر
لا کہیں سے وہ لالہ رنگ شراب — جس سے مست گزارہ ہوا حباب
آؤ مطرب لئے رباب و چنگ — کار طوسو منہ سے نوائے سیر آہنگ
ہر طرف رقص میں ہیں گل رویاں — ہائے گویاں ہیں سلسلہ مویاں
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار — صحبت عیش کو چکا یک بار
لالہ رنگ رخ نکویاں کو — مایہ ناز خوبرویاں کو
اس پری کو نکال شیشہ سے — رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے — ایک دم جام متصل دے دے

(مثنوی در بیان کتخدائی آصف الدولہ)

تہواروں سے متعلق رسم و رواج

شادی کا سماں آپنے دیکھ لیا اب
ذرا ہولی کا رنگ بھی دیکھئے۔ عام تہواروں میں کیا کیا تقریبات ہوتی تھیں
وہ کسی قدر ہولی سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ہولی میں سب مدہوش و مست
ہیں، راستوں کے دونوں طرف خوبصورت عمارتوں کے رنگین ستون ہیں
جنہیں خوبصورت کاغذی پھولوں سے سجایا گیا ہے، ہر شخص زعفرانی
لباس میں ملبوس ہے گلال و عبیر اڑ رہے ہیں سب کی پگڑیاں اور کپڑے
کچھ اس طرح رنگوں سے مزین ہیں جیسے ان پر پھول بنے ہوئے ہیں۔ یہ
کیفیت واقعی دیدنی ہوگی۔

ہولی کے موقع پر رقص کا خاص اہتمام تھا، زن و مرد کی باہمی۔

چھیڑ چھاڑ جاری ہے ان کے ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑیاں ہیں اور گلال کے قمقمے بنا کر ایک دوسرے پر مار رہے ہیں اور لطف لے رہے ہیں ابیر کے ساتھ کاغذ کے پھولوں کی پتیاں کتر کر اڑائی جا رہی ہیں۔ اس طرح تمام فضا رنگین بن گئی ہے، شراب نوشی کی بھی کثرت ہے۔ ہولی کی اس رنگا رنگی کو دیکھ کر میر اس جشن کو نوروز سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر لباب ہیں آب گیر رنگ	اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پاس آتے ہیں مرغ گلشن پھول	تھے سے دلبر گلاب کے سے پھول
زعفرانی لباس تھے سب کے	رسم سے آئے صبح کر شب کے
گرتیاں جامہ بھیگی بھیگی سو سو ہیں	ان کو گلہائے تر کہیں تو کہیں
چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ	سینکڑوں پھولوں کی چھڑی لیے ساتھ
قمقمے جو گلال کے مارے	ہو نشان لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں	گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے	راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

(مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی)

ان اشعار میں واقعیت نگاری کے علاوہ میر کی نظر اور فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

زعفرانی رنگ سے رنگین لباس	عطریات سے پھولوں میں گل کی باس
مرغ گلشن گلدستاں کو جاڑ پھول	بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول

ذیل میں تو یہاں ہولی کے نام سے ملتا ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے جیسے یہ عام تہوار نہ ہو بلکہ کسی شادی کے موقع کی رسم ہو۔
اس موقع پر سب ہی شریک ہوتے تھے اور لطف لیتے تھے، عموماً ایسے

موقعوں پر طرح طرح کی مضحکہ خیز نقلیں پیش کی جاتی تھیں کوئی حاجی بنتا کوئی فقیر، کوئی جوگی، کوئی اوباش اور کوئی بنیا۔

آئے نقلیں بنا کے صورت باز — ڈوم ڈھاری بنے بجا کر ساز
نقل نقول کی سو حاجی بنے — بچ کے عمامے سر پہ کتنے جنے
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا — کوئی داڑھی لگا کے پیر بنا
کوئی بنیا بنا کوئی اوباش — نقل کی تھی ان سبھوں کی معاش
کوئی شاعر بنا جوں کا نظیر — جیسے مستغرق خیال تھا میر
کچھ سپاہی بنے بنے کچھ تجار — کوئی زاہد ہوا کوئی خمار

(مثنوی در جشن ہولی وکتخدائی)

اس موقع پر رقص کا خاص اہتمام ہوتا تھا مندرجہ ذیل اشعار اس زمانے کے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

آدھی رات کی قرار ہے باہم — کہ تماشا کنان پھرے
زن رقاص پر نگاہیں کریں — کسو سادے سے چل کر راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ — کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ
کہیں دو جام سے ہو سرمست — جائیں گے تھوڑی دیر دست بدست
کسو نہوش سے ہو دیں گے گلباز — کھینچیں گے ایک دو دم اسکے ناز

آصف الدولہ کو اس تہوار سے بہت دلچسپی تھی وہ اسے بہت شاندار طریقے پر مناتے تھے تمام دن گلال و عبیر اڑتا تھا اور رقص وسرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ دریا کے کنارے روشنی اور آتش بازی کا تماشہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عوام ایک دوسرے پر بے تکلفی سے رنگ پھینکتے تھے۔ یہ جشن شہر کے عوام لوگ اور امرا یکساں طور پر مناتے تھے۔ اس سے اس زمانے کے

سماجی میل جول پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہولی کی رات روشنی کے لئے راہ میں ترپولئے مینار بنائے جاتے تھے، دریا کے دونوں طرف ٹٹیاں لگا کر چراغاں کیا جاتا تھا، کشتیوں میں دیئے بھر کر جلائے جاتے تھے۔ جن کا عکس پانی میں عجب حسن پیدا کرتا تھا۔ ایسے سوانگ بنائے جاتے تھے جنہیں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ سارا جہاں ہیکلینے کا کھیل ہے۔ اس جشن کے موقع پر رات کا دلکش منظر ملاحظہ کیجئے۔

روشن الدولہ نے کی تھی روشنی — کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک — تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں ترپولئے مینار تھے — روشنی کے کوچہ و بازار تھے
گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا — اس روش کی دھوم کا اودھم تھا
اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں — دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں
ٹٹیاں دریا کے باندھے دو طرف — کیا چراغاں آسماں کی ہر طرف
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے — رات دن تھی روشنی کے نور سے
سوانگ کیا کیا بن کے آئے دریا — ہیکلینے کا سوانگ تھا سارا جہاں

ہولی کی رات میں نواب کی سواری نکلتی تھی۔ اس کے ساتھ رنگے ہوئے ہاتھی ہوتے تھے ان مواقع پر اہل فرنگ بھی نواب کی خدمت میں آتش بازیوں کے تحفے پیش کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمان حکمراں رسماً یہ تہوار نہیں مناتے تھے بلکہ اسے اپنا خاص تہوار سمجھ کر مناتے تھے

نذر کو نواب کی اہل فرنگ — لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گل ریزی سے روشن ہوگیا — چرخ ان تاروں سے روشن ہوگیا
کیا ہی آتش دستیاں دیکھ گئے — شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے

(مثنوی در بیان ہولی)

اگرچہ لکھنؤ کی حالت بھی سیاسی اعتبار سے کچھ بہتر نہ تھی لیکن معاشی حالات اچھے ہونے کی وجہ سے دہلی کے مقابلہ میں یہاں کی زندگی مجموعی طور پر رنگین تھی۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"اس زمانے کی جملہ کیفیتیں اسلامی شان و شوکت کی آخری جھلکیاں تھیں اور جس طرح کہ عام طور پر سلطنت کا ہاتی دور ختم ہونے کے بعد اسکے آخری دور میں عیش و عشرت کی زیادتی ہونے لگتی ہے اور بیہودہ مراسم رائج ہو جاتی ہیں ہندوستان میں مغل حکومت کا بھی یہی انجام ہوا چنانچہ بادشاہوں اور امراء کی عیش پسند ہونے کی وجہ سے رعایا بھی قسم قسم کی بدعنوانیاں پر آمادہ ہو گئی تھی۔" (۱)

نوروز "ساقی نامہ" بھی میر کی ایک مثنوی ہے۔ اس کے ایک شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مثنوی نوروز کے موقع پر تصنیف ہوئی۔

لا بادۂ کہنہ سال نو ہے سجادہ بھی بابت گرو ہے

میر نے اس جشن کی تفصیلات کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جشن ان کے زمانے میں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اس جشن کے متعلق ڈاکٹر محمد عمر اپنی کتاب "اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت" میں لکھتے ہیں۔

"اورنگ زیب نے مذہبی نقطہ نظر کی وجہ سے یہ جشن ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس کے بجائے رمضان کے مہینے بھر ایک جشن جاری کیا تھا، جس کو نشاط افروز کہتے تھے، اس کے جانشینوں نے "جشن نوروز" کو دوبارہ

---

(۱) تین شاعر میر انیس اور ہدیس اسمتو پر ایک تنقیدی نظر ص ۶۵-۶۶

رائج کیا۔ ۱۸۵۷ء تک دربار مغلیہ اور عوام میں یہ جشن جاری تھا۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں یہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس دن بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ اس کو سال نو کی مبارکباد دی جاتی۔ نوروز کے دستور کے مطابق اس دن نئے کپڑے پہنے جاتے۔ اور رقص و سرود کی محفلیں سجتی تھیں۔"

ڈاکٹر محمد عمر نے اودھ میں یہ جشن کس طرح منایا جاتا تھا اس کے متعلق لکھا ہے کہ۔

اگر رات کے وقت نوروز کی آمد ہوتی تو لباس کا رنگ سیاہ ہوتا اگر دوپہر ہوتی تو لباس کا رنگ گہرا سرخ اور بھڑکیلا۔ ہر طبقہ کے لوگ یعنی بادشاہ سے لے کر ادنیٰ تک یہی لباس پہنتے تھے۔ اس دن دربار منعقد ہوتا تھا نواب تخت پر جلوہ افروز ہوتا۔ درباری امراء اور ملازمین نذریں پیش کرتے لوگ ایک دوسرے کو نوروز کی مبارکباد دیتے بادشاہ بذات خود اپنے امراء کو نوروز کی مبارکباد دے کر مثال قائم کرتا۔ محل شاہی میں عصرانہ کی ضیافتیں ہوتیں تحفہ تحائف بھیجے جاتے۔ دیگر رسومات کے علاوہ اس دن انڈے لڑانے کی رسم بھی ہوتی تھی، مذہبی لوگ اس دن دعائیں کرتے اور نمازیں پڑھنے میں گزارتے تھے، عورتوں میں دوسری ایک رسم یہ بھی رائج تھی کہ اگر انہیں معلوم ہوتا

---

(۱) ص ۔ ۲۲۹ ۔

کہ نوروز کا آغاز دن کی روشنی میں ہوگا تو وہ کچھ دیر تک
ایک تھال پر نظر گاڑ کر دیکھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ جب
نوروز کا آغاز ہوگا تو گلاب کی کلی کھل جائے گی لہٰذا گلاب
کی ایک کلی توڑ کر تھال میں ڈال دیتی تھیں اور اس میں پانی
بھر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نوروز
کے آغاز کے موقع پر خود بخود اس پھول کا رخ سورج کی جانب
ہوجائے گا۔ درباری شعراء اس دن کی مبارکباد کے لئے
تہنیت نامے موزوں کرتے دربار میں جاتے اور انعامات
حاصل کرتے تھے۔" (۱)

جشن نوروز کے علاوہ اور بھی اس قسم کے بہت خاص خاص محفلیں
ہوتی تھیں رت جگے ہوتے تھے۔ آخری چہار شنبہ تو اب بھی منایا جاتا ہے
اس کے علاوہ خواجہ خضر کی چھڑیاں سلونوں اور پھول والوں کی سیر بھی
منائی جاتی تھی۔

موت سے متعلق رسمیں میر کی مثنویوں سے جس طرح ہندوستانی تہواروں
اور شادی کے رسم ورواج پر روشنی پڑتی ہے
اسی طرح موت کی رسموں کے متعلق بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں، مثلاً مردے
کو جلانے کی رسم خالص ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے، اگرچہ زرتشت
مذہب سے بھی آگ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جلانے کی رسم
خالص ہندوستانی ہے اور اس کا تعلق آریوں سے ہے۔

---

(۱) ص ۹۰م-۹۱م۔

"مثنوی شعلہ شوق" میں جب پرسرام کا دوست اس کی بیوی کی آزمائش کرتا ہے اور وہ آزمائش میں پوری اتری ہے یعنی مرجاتی ہے تو پرسرام اپنے مذہب کے دستور کے مطابق اسے جلانے کیلئے مرگھٹ لیجاتا ہے

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے — لب آب جاکر جلایا اسے
جب آگ اسکے پیکر پہ سب چھا گئی — محبت عجب داغ دکھلا گئی

آریوں میں مردے کو جلانے کی رسم اس لئے ادا کی جاتی تھی کہ انسانوں کو ارواح خبیثہ سے نجات مل جائے گی، وہ بھی دوسروں کو نہیں ستائیں گی اور اگر ان کے جسم میں بدروحیں داخل ہوگئیں تو وہ بھی آگ کے خوف سے نکل بھاگیں گی۔ آریوں کا خیال تھا کہ آگ خدا نے زمین پر اس لئے اتاری ہے کہ جو چیز اس کے سپرد کی جاتی ہے وہ اسے خدا تک پہونچا دے، اسلئے جس مردہ کو سپرد آتش کیا جائے گا وہ ضرور خدا تک پہونچ جائے گا۔ اور وہاں یم راج کے ملک میں جاکر وہ اپنے آبا سے ملاقات کرے گا وہیں اس کی ساری زندگی کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔"(۱)

مردے کو جلانے کے علاوہ ستی کی بھی رسم جاری تھی۔ یہ رسم بھی خالص ہندوستانی ہے۔ راجاؤں کی عورتیں اگر بوڑھی نہیں ہوتی تھیں تو ستی ہوجاتی تھیں۔ ویسے سب ہی بیواؤں کے لئے ستی ہونا لازمی تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اس رسم نے بہت ترقی کرلی تھی، عورتیں کثرت سے اپنے شوہروں کی موت کے بعد ستی ہوجاتی تھیں، لیکن ۱۸۳۲ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور اسے ختم کردیا۔

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں۔ از ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ ص ۲۸۵-۲۸۶

میر کی ایک مثنوی میں بھی رسم ستی کا ذکر موجود ہے۔

مثنوی عشقیہ میں جب ہیروئن کا شوہر دق میں مبتلا ہوکر ختم ہوجاتا ہے لوگ اس کو جلانے کے لئے مرگھٹ لے جاتے ہیں تو عورت اپنے مذہب کے دستور کے مطابق شوہر کے ساتھ جلنے کے لئے آمادہ ہوجاتی ہے۔

جلانے کی تیاری کرنے چلے چلی زن بھی تا ساتھ اسکے جلے

ڈاکٹر سید محمد عقیل اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ ستی کی رسم قدیم سوتروں کے زمانے میں بہت عام تھی۔ مردہ کی بیوی کچھ عقیدوں کےمطابق لاش کی بائیں جانب چتا پر لیٹتی تھی اور کچھ عقیدوں میں بیوی کا شوہر کے سرہانے شمال جانب لیٹنا مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ تب سب سے قریبی سوگوار لاش کو مخاطب کر کے کہتا۔

"اے فانی یہ عورت چاہتی ہے کہ دوسری دنیا میں بھی تیری وفادار رہے اسے اجازت دے کہ دوسری دنیا میں بھی تیرے ساتھ جائے اور تیری دولت وارثوں کیلئے چھوڑ جائے"

اس کے بعد مردے کا چھوٹا بھائی یا اس کا چیلا یا کوئی نوکر چتا کے قریب جاتا اور عورت کا بایاں ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

" اٹھ عورت تو ایک مردہ جسم کے بغل میں لیٹی ہے، آ زندوں کی دنیا میں الگ ہو اپنے شوہر سے اور اس شخص کی بیوی بن جا جو تیرا ہاتھ پکڑے ہے اور تیرے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہے۔ (۱)

مثنوی عشقیہ میں بھی جب عورت جلنے پر آمادہ ہوجاتی ہے اور چتا

---

(۱) اردو مثنوی کا ارتقاء از سید محمد عقیل متذکرہ

میں آگ لگا دی جاتی ہے تو افغان پسر ہیردتن کا عاشق اس کو بچانے کیلئے آگ میں کود پڑتا ہے۔

لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو | خبر ہو گئی اس تو گرفتار کو
کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی | نظر اس کی جلتے جو اس پر پڑی
کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم | شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

(۱۲) مشاغل | اس زمانے کی بزم آرائیوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں میر کے شکار ناموں میں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ شکار نامے عہد آصف الدولہ کی یادگار ہیں۔ آصف الدولہ کو شکار سے بہت دلچسپی تھی، سال میں کم سے کم دو مرتبہ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اس لئے ایسے موقع پر روپیہ فراخدلی سے خرچ کیا جاتا تھا، ان مقامات پر جہاں شکار کھیلا جاتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر لکھنؤ وہاں جا کر آباد ہو گیا ہے۔ ایسے شاندار قافلہ کے ساتھ میر کو بھی دو بار جانے کا اتفاق ہوا، انہوں نے اپنی مثنوی شکار نامہ میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جس سے ہمیں اس زمانہ کے لکھنؤمیں دولت کی فراوانی کا علم ہوتا ہے۔ ان شکار ناموں میں ان کی ہرایچ اور کوہ شمالی کی مہمات کا ذکر کیا ہے جس میں فوج نے بھی حصہ لیا تھا، ان شکار ناموں میں انہوں نے جنگل کا نقشہ موسم کی دلفریبی، رنگین جانوروں کا شکار کیا جانا اور بادشاہ کے خیمہ وغیرہ کے تذکرے بڑی خوش اسلوبی سے کئے ہیں، جو اردو میں نیچرل شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ مثلاً ازخرد ارے دیکھتے چلئے: بادشاہ اور امراء اپنی فوج کے ساتھ شکار کے لئے نکلے ہیں، جنگل کے تمام جانور خوفزدہ ہیں، شکار اتنی کثرت سے کیا جاتا ہے کہ دوسرے کھانوں کی ضرورت پیش نہیں آتی پوری فوج گوشت ہی کھا کر سیر ہو جاتی ہے۔ جانوروں میں چیتل، باڑہ، ارنا

ریچھ، سارس، ہرن، نیلا، خرگوش، لومڑی، گھڑیال، سوسماس، طاؤس
بلبل، قمری، سرخاب، مرغابی، مگرمچھ، کچھوے، قاز، بطخ، کلنگ، قرقرہ
اور تیتر وغیرہ شکار کیے جاتے ہیں۔ اور مچھلیوں کا شکار بھی۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار — نہا دیا باں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانوں سے جانے لگے — وحوش اپنی جانیں بچانے لگے

⁘

کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں — کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں
پڑے سیکڑوں دام تالاب میں — نہ چھوڑی تنک خاک اس آب میں
نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ — نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ
رہے گوشت ہی پکتے ہر صبح و شام — جواں کھا گئے مرغ و ماہی تمام

⁘

پلنگوں نے کہسار سے راہ لی — نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بچیرے جو تھے دام سے چھا گئے — کشف نیچے ڈھاووں کے گھبرا گئے
درندے، پرندے، چرندے کچھے — گزندوں کے منھ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں — گوزن اور گورا در آہو کہاں

⁘

ٹھٹک سونس گھڑیاں رہ رہ گئے — مگرمچھ نہ جانے کدھر بہہ گئے
نہ قشقل نہ مل نہ سرخاب ہے — تمام ان کے لہو سے سرخ آب ہے
ملے برسے پرتے ہوا کے کلنگ — کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ
قیامت تھی، آفت تھی ہر ایک چوٹ — لگے جس کے پھر تھا وہیں لوٹ پوٹ

ہوئے خون اس جمع کے بید رنگ ہوا کا ہوا اور اک دم میں رنگ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکار کے ان موقعوں پر جنگل کے جنگل اجاڑ دیئے جاتے تھے

گئے جانور دشت خالی ہے بیابان جھاڑے گئے تو کہے
نہ چیتل نہ پاڑھا نہ ارنا نہ شیر ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر
کسو بن میں رونق نہ پائی گئی پھر اس پر جو ایسی ادائی گئی
جگرداں کے خیروں کے پھٹ پھٹ گئے بیاباں سے کرگدن ہٹ ہٹ گئے
نہ فیلوں میں سدھ بدھ نہ شیروں میں زور نہ چیتوں میں جا گہہ نہ گوروں کو گور
نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اکھاڑ (۱)

کبھی کبھی نوابان اودھ مغل شہنشاہوں کی طرح ہاتھیوں، شیروں اور دوسرے مختلف جانوروں کو دیکھ کر لڑتا ہوا لطف اندوز ہوتے تھے اور آہستہ آہستہ وہ اسی کے ہو کر رہ گئے، اور نوبت مرغ بازی اور بٹیر بازی تک پہونچ گئی، نوابان اودھ خصوصاً شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کو مرغ بازی کا بہت شوق تھا، میر کی مثنوی "مرغ بازاں" سے بھی اسکی تشریح

---

(۱) ان شکار ناموں میں پہلے میں چھ اور دوسرے میں گیارہ غزلیں ہیں جو بے موقع معلوم ہوتی ہیں، لیکن مثنوی میں غزل کا لکھنا ایک روایت ہے۔ ان شکار ناموں کو میر نے آصف الدولہ کی خدمت میں بھی پیش کیا تھا اس مثنوی کے آخری اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر لکھنؤ تو آگئے تھے لیکن یہاں کا ماحول انہیں بالکل پسند نہ تھا اور جتنی قدر و منزلت وہ چاہتے تھے انہیں نصیب نہ ہو سکی۔

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر کر لے چلو بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

ہوتی ہے، میر کی ملاقات بھی آصف الدولہ سے ایسے ہی موقع پر ہوئی تھی۔ مرغ بازی کا شوق تقریباً ہر طبقہ میں پایا جاتا تھا، اسلئے یہ بازی کسی ایسے مقام پر ہوتی تھی جہاں عوام بھی شرکت کر سکتے تھے، مرغ بازی کے لئے عموماً جمعرات: دنگل کا دن مقرر تھا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے کہ۔

"مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا، نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا، نواب سعادت علی خان باوجود بیدار مغز ہونے کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امرار دربار اور اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے انہیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن اول درجہ کے مرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خان سے بازی بدکر مرغ لڑایا کرتے تھے۔"[۱]

میر نے اپنی مثنوی میں اس زمانے کی مرغ بازی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

جمعہ دنگل کو یاں کی ہے دھوم	گلیوں میں زور کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت کا جوش	جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں	سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے	ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج	ساتھ اسکے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے	ان کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ	ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں	لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ ص ۱۷۶

ایک کے منہ میں مرغ کی منقار ایک کے لب پہ نا سزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے بعد نصف النہار رخصت ہے
(مثنوی دربیان مرغ بازاں)

اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب مرغ شرط لگا کر لڑائے جاتے تھے تو ان کے لوہے کے کانٹے باندھ دیئے جاتے تھے، اسی ضمن میں ان شاعرانہ تمثیلات کا بھی ذکر کیا ہے، جو مرغ کی ذات سے متعلق ہیں، جیسے مرغ خیال، مرغ عیسیٰ، مرغ تصویر، مرغ آئین، مرغ زرین بال، مرغ روح اور مرغ قبلہ نما وغیرہ، اس سے اس دور کے ادبی رجحان یعنی ضلع کہنے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان مرغوں کے مالک اپنے مرغوں کی بہت حفاظت کرتے تھے، چاہے کسی سے کتنا قریبی تعلق کیوں نہ ہو اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، میر نے تو مرغ کا مرثیہ بھی لکھا ہے، پہلے اس اشرف الطیار کی تعریف کے دو شعر دیکھئے

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں گیا آج برنگ کلہ تاج خروس سر پر تاج
جو بیٹھے چھاؤں میں پرواز پر کرے مرغ خیال کھڑا ہو دھوپ میں تو رشک مرغ زریں بال

پھر جب بلی نے اسے نیچا دکھا دیا تو مرثیہ کا یہ انداز دیکھئے۔

جھکا جو خاک کی جانب کو کس لیے کا زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیمان کا
وہاں جو نور مرغاں قدس بانہ ہوا کہ مرغ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا
ہر اک کے مرغ ہوئے داغ اسکے ماتم سے یا وہ پوش رہے طائر حرم غم سے

بظاہر یہ ایک مرغ کی زندگی اور اسکی موت کی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر اگر ایک طرف فرد مسکین کے سینہ سپری کا گمان ہوتا ہے تو دوسری طرف

اسکے پیچھے سلاطین و امراء کے عروج و زوال کی پوری داستان پوشیدہ ہے جس کے مناظر خود میر کی آنکھوں نے دیکھے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نوحہ و غم کے تمام تاثرات انکی مثنوی میں شامل ہو گئے ہیں، بقول مجھے "زوال پذیر سماج کی نشان دہی اس سے بہتر ممکن نہیں ہو سکتی، شاعر کا درجہ اگرچہ پیغمبری تک پہونچتا ہے تو میر کا شمار بھی ان ہی پیغمبروں میں کیا جا سکتا ہے، میر کی یہ مثنوی انکے جذبات کی ہی عکاسی نہیں ہے بلکہ اس میں مشاہدہ کی بصیرت بھی شامل ہے" (۱)

پالتو جانوروں کے ضمن میں میر نے ایک مثنوی میں ایک بکری اور اس کے دو بچوں کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ بکری کے دونوں بچے جب پیدا ہوئے تو دودھ کی کمی کی وجہ سے بھوکے رہتے تھے، اس موقع پر انہوں نے بچوں کی پرورش کی اور بازار سے دودھ منگا کر ان کی بھوک مٹائی،

دودھ منگوایا گئے بازار سے پھوہوں سے دنیا کیا انظار سے

(مثنوی دربیان بزم)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میر کی بلی موہنی کا بھی تھوڑا سا ذکر ہو جائے میر کے یہاں کہیں سے ایک بلی آ گئی گھر کے لوگوں کی ہمدردی محبت اور شفقت دیکھ کر وہ جلد ہی سب سے مانوس ہو گئی، گھر والوں نے اس کا نام "موہنی" رکھا رفتہ رفتہ وہ میر سے بھی مانوس ہو گئی اور پاس آنے اور پیار سے بیٹھنے لگی،

آئی ہے میرے پاس یہ اٹھ کر سویر گریہ زرد فلک سے دیر
یعنی وقت گرگ و میش آئی ہی پاس پھر مرا پہروں کیا ہے انکے پاس
بیچ میں ٹکڑا جو کچھ پایا کرے فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

---

(۱) اظہر راہی۔ دلی کالج میگزین میر نمبر (میر کی ہجویہ شاعری) ص ۱۸۶

بختوں سے چھینکا بھی ٹوٹا ہے اگر — ان نے مطلق کی نہیں ادھر نظر
دخل کیا ہے جانکے پر چھیکے کی اور — گربے کو دیکھے نہ گر بھو کی ہو زور
اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا — خوف سے آپ ہی کبھے چوہا ملا
ایک بلی کچھ گئی تھی آکے چکھ — یہ لڑی تو منہ پر اپنے پنجہ رکھ
(مثنوی دیگر)

بظاہر میر نے ان اشعار میں اپنی بلی کی قناعت پسندی اور وضع داری کو بیان کیا ہے لیکن اسکی توجیہ یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ اشعار میر کے زمانے کے اس غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، جو غریب ہونے کے باوجود اپنی وضع داری اور قناعت پسندی پر قائم تھا۔

بہر حال موہنی کے بھی پانچ بچے ہوئے جن میں سے تین لوگوں نے مانگ لیے صرف دو باقی رہ گئیں کچھ دنوں بعد موہنی بھی چلی گئی۔

مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار — رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میرے اس کی خوابگاہ — دل سے میرے خاص اسکو ایک راہ
میں نہ ہوں تو ماہ دیکھے کچھ نہ کھائے — جان پاوے سن مری آواز پائے
(مثنوی دیگر)

اس سے اس زمانے کے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی نیک خصلتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بندر اور کتے وغیرہ کے پالنے کا مشغلہ بھی لوگوں میں پایا جاتا تھا، ان کی مثنوی ”سگ و گربہ“ سے جہاں ایک طرف مشاغل کا پتہ چلتا ہے وہاں میر کے عہد کی معاشرتی زندگی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں — وہ ہیں قالب اور انکی ایک ہی جاں
رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ — آنکھیں اسکی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہووہ مادہ سگ   بھوکا بیٹھا رہے قیامت تک
کب مروّت سے جائے کھانا چکھ   لڑے بھی ہے تو منھ پہ پنجہ رکھ

اب مادہ سگ کی بھی خصوصیت دیکھئے۔

کسی کے لقمہ پر نہ منھ ڈالا   سگ اصحاب کہف کی خالہ
نہیں کتوں سے خواریاں کرید   ہے سگوں میں عزیز خاں کرید
دے ہرن کو بھی جلدی میں بتا   ہے گا یاں سگ لونڈیا کتا
اڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہے   استخوان سگ شکاری ہے
پر جو غصہ میں آوے تو ہے غضب   اسکے مارے ہوئے ہیں ہار سب
منھ میں دیتے ہیں اسکے جب مشغل   طرفہ دم لابہ کرتی ہے اچپل
منھ میں اپنے لے ہر قبیلے سے   سگ لیلیٰ کے ہے قبیلے سے
باہم اس کتے بلی کا یہ ربط   کوئی دیکھے نہ ہووے اس کو ضبط
کبھو جاتا ہے جو یہ کوٹھے پر   لگی رہتی ہے اسکی چھت سے نظر
اور سے دشمنی جتاتی ہے   اس کی یہ بادلی دوانی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میر کا خیال ہے کہ ان نیک اوصاف کے ذریعے غریب سے غریب انسان بھی خوش حال زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان شنویوں سے ان کی مفلوک الحالی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔

جانوروں سے میر کی یہ محبت ان کی نرم دلی، شفقت، خلوص اور خاطر گھریلو زندگی سے دلچسپی کا ثبوت ہے اور سماجی اعتبار سے انکی شاعری اور شعور کے اس پہلو کی بڑی اہمیت ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے محبت میر کی روح مجروح اور دل شکستہ کے لئے ایک مرہم زنگاری ہی کی

حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس سے عام انسانوں کی زندگی میں خوشیاں دلچسپیاں اور جذباتی سہارے جنم لیتے ہیں۔ ان قطعوں کے ذریعہ میر نے نہ صرف اپنے بلکہ اس دور کی تباہیوں اور بربادیوں میں شریک درمیانی طبقہ کے نفسیاتی ردعمل کو پیش کر دیا ہے۔" (۱)

(۲) ادبی روایات

طعن و تشنیع نوک جھونک فقرہ بازی ہم پیشہ لوگوں میں ہوتی رہی ہے ویسے بھی یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں کسی نہ کسی وصف کی وجہ سے اپنے آپ دوسروں سے ممتاز سمجھتا ہے۔ دنیا میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس سے بری ہوں ایسی ہی کوئی بات بڑھ جاتی ہے تو دنیا میں بڑے بڑے معرکے وجود میں آتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ بقول لکھنے "اردو زبان و ادب کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ اس کی زندگی پر ابھی چند صدیاں گزری ہیں لیکن ادبی معرکہ آرائیوں کے اعتبار سے اسکے دامن کی وسعت باعث حیرت ہے۔ ملکی و سیاسی معرکہ آرائیوں میں انسانی زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے، تباہی و بربادی کا دور دورہ رہتا ہے، امن و امان کے ایوان میں رخنے پڑ جاتے ہیں مگر ادبی و لسانی معرکے زبان و ادب کی ترقی میں معاون ہوتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ و مضامین اور محاورات اچھوتے استعارات نادر تشبیہات الفاظ کی انوکھی تراش و خراش اور دلچسپ ضرب الامثال سے زبان کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا ہے۔" (۲)

---

(۱) غیر مطبوعہ

(۲) امیر حسن نورانی، اردو کے ادبی معرکے از عہد سودا تا چکبست و شرر ص ۸۔

ولی کے زمانے سے دلی میں شعر و سخن کی محفلوں نے جنم لیا اور کم و بیش اسی زمانے سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا جو درباری داری کا نتیجہ تھا، کیونکہ اس زمانے میں سیاسی زوال کے ساتھ معاشی نظام پر بھی انحطاط کی کیفیت طاری تھی، عموماً متوسط اور تہذیب یافتہ طبقہ معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ اس حال میں شعراء کسی امیر سے وابستہ ہوئے بغیر خوش حال زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے اسلئے ہر شاعر کسی نہ کسی امیر یا رئیس سے وابستہ ہو جاتا تھا، اس طرح مشاعروں میں شعراء ایک طرف تو ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے تو دوسری طرف وہ انعام و اعزاز حاصل کرنے کیلئے اپنے سرپرستوں کی خوشنودی بھی چاہتے تھے یہ خیال آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا اور اس جذبہ نے آگے چل کر شعراء میں زبردست نااتفاقیاں پیدا کر دیں، جس کا نتیجہ ایک دوسرے کی مذمت کرنے کی شکل میں نکلا اور اسطرح انھوں نے ایک دوسرے کی خوب خوب ہجویں کیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر جیسا قلندرانہ مزاج رکھنے والا بھی زمانے کے اس عامیانہ رنگ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا، غزلیات میں تو اکثر جگہ یہ بات ظاہر ہے لیکن بعض مثنویوں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر وہ ضبط و صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "در ہجو نا اہل مسمی بر زبان زد عالم" بھی ان کی اسی قسم کی مثنوی ہے جسمیں انہوں نے اپنے حریف کے مقابلے میں اپنے آپ کو افضل اور اسے نا اہل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، میر کی اس مثنوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کسی کی ہجو میں پہل نہیں کرتے تھے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ اس وقت ان لوگوں کو جتنی شہرت حاصل ہو رہی ہے وہ سب میری وجہ سے ہے، ان میں کوئی

حقیقی اور فطری شاعر نہیں ہے، کیونکہ کسی نے میرے دیوان کی نقل کی ہے اور کسی نے میرا رنگ (طرز) چرایا ہے۔ لیکن بہر حال اس سے میری بزرگی اور قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ میری تو خود ہی شہرت سارے عالم میں چھائی ہوئی ہے اور پھر میری جیسی شخصیت تو خدا کی دین ہے۔ جو ہر ایک کو نہیں ملتی۔

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام	چھیڑتا ہے مجھکو ایک تخم حرام
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا	در دمند و عاشق و دلریش تھا
پر کروں کیا لا علاجی سی ہے اب	غصہ کے مارے چڑھی ہے مجھکو تپ
ایسے کہتے ہیں جواب شاعر بنے	مدتوں پر لونڈے آئے مجھ کنے
ایک باتوں سے میری آدم ہوا	اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا
ایک نے دیوان کے میرے نقل لی	اس دیوانے کی کہنو نے عقل لی
ایک میرے طرز پر کہنے لگا	دوسرا پیرو میرا رہنے لگا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا	مستند ہے میرا فرمایا ہوا
ہے گی شخصیت خدا کی اور سے	ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے[1]

---

(۱) یہ ہجو مرزا فاخر مکین کے شاگرد بقا کی ہے جو میر کے سخت مخالف تھے انہوں نے اپنی ہجوؤں میں میر پر خوب نکتہ چینی کی ہے ایک جگہ کہا ہے۔

تو ہے شیخ زاہد کی تو بہ تلی ہے	چلے بیٹھے تو شیخ چسلی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر	اور بستی نہیں یہ دلی ہے

اور ایک مرتبہ بقا نے یہ شعر کہے۔

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے	دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

میر کا زمانہ جاگیردارانہ نظام کا زمانہ تھا اس میں پیشہ ور ذاتوں اور محنت مزدوری کرنے والوں کو باعزت نہیں سمجھا جاتا تھا، اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص شریفانہ معاشرت اختیار کرتا یا انکی دلچسپیوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتا تو اسے بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا چنانچہ میر کے زمانے میں اس نچلے طبقہ کے جن لوگوں نے شعر و شاعری میں حصہ لیا ترقی کرلی اور ان میں سے بعض استاد بھی کہلانے لگے میر نے ان کی خوب ہجو کی ہے۔

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف | کسب کرتے جن کی تھیں طبعتیں لطیف
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو | کچھ بتاتے تھے بھی اشراف کو
تھے جو اس ایام میں استاد فن | نا کسوں سے وہ نہ کرتے تھے سخن
ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم | یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم
پیار کرتے تھے انہیں استاد فن | ان کے ہوتے رہبر راہ سخن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں | ٹکڑے جو میرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

اس زمانے میں میر نے یہ شعر کہا۔

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

میر نے خدا معلوم کس موڈ پر یہ شعر کہا تھا، لیکن بقا اسے برداشت نہ کرسکے اور فوراً یہ قطعہ لکھا۔

میر نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا | اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا ہے تیری
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے | اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

(اردو ادب کے معرکے)

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار   شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا   شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

(مثنوی تنبیہ الجہال)

میر کا خیال ہے کہ شاعری کوئی پیشہ نہیں کہ اس کو ہر شخص اختیار کرے، اس کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے ورنہ اگر ہر شخص اسکو اختیار کرے گا تو پھر دوسرے کام کون کرے گا۔

پھر حصول اس سے نہ دنیا نے دیں   کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں
گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو   ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
حاجت اس فرقہ سے مطلق یاں نہیں   جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصان نہیں

وہ اپنے ہم عصر شعراء سے نالاں ہیں کیونکہ

الغرض یاروں نے تیریں دیں اٹھا   جو کوئی آیا اسے دی پاس جا
ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو   کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو
سر میں رکھ کر دعوی طبع لطیف   میر مرزا کا ہوا آخر حریف[1]

اپنی مثنوی "مذمت آئینہ دار" میں بھی انہوں نے کچھ اسی قسم کے خیالات نظم کئے ہیں۔

مو تنگا قوں کا نہیں ہے نام اب   مدعی شعر ہیں حجام اب
ان سے کیں اک مو برابر بھی نہیں   جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں
یاں نہ سید کچھ ہے نے نائی ہے شرط   ہر کسو کسوت میں دانائی ہے شرط

---

(۱) اس سلسلے میں میر نے ایک حکایت بھی بیان کی ہے جس میں فارسی شاعر ہلالی کا ایک واقعہ نظم کیا ہے۔

میر و مرزا میں حکم ہووے خرد — نے کی نالی جن پہ سب کا دستِ رد

مجھے مرزا میر کو مرزا کو میر — نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت — یاں تمانی واں عجالت ہے بہت

جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زبان — ہوتے اس جاگہ جو مرزا لے گئے

استرے کانوں میں اپنے باندھ کر — کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر (۱)

میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف آج تو ہر شخص کرتا ہی ہے اور انہیں اردو کی دنیائے شاعری میں "خدائے سخن" کہا جاتا ہے، لیکن اپنے زمانے میں بھی ان کی عظمت مسلم تھی، دور دور تک ان کی شاعری کے چرچے تھے چنانچہ انہیں خود بھی اپنے اوپر فخر تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں کسی کو بھی ہم پلہ نہ سمجھتے تھے۔

میر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا، ایک تو میر فطرتاً نازک مزاج تھے دوسرے بڑھتی ہوئی شہرت نے ان میں فخر کا مادہ بھی پیدا کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہم عصر شعراء میں سودا کو صرف پورا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ میر درد کو آدھا اور میر سوز کو چوتھائی، برتری کا یہی احساس تھا۔ جس نے ان سے ایک مثنوی "اژدر نامہ" لکھوائی۔ جس میں انہوں نے شعرائے عصر کو بطور تمثیل مینڈک، چوہا، چھپکلی، لومڑی اور گرگٹ قرار دیا، اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنے آپ کو اژدر۔ اور جب

---

(۱) ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ یہ ہجویہ مثنوی سودا کے شاگرد عنایت اللہ کی ہے جسکی عرفیت کلو حجام تھی اور جسے شاعری کا دعویٰ بھی تھا۔

اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ص ۲۳۴

ان سب سے اژدر کا مقابلہ ہوا تو اس نے سب کو فنا کر دیا، یہ مثنوی میر نے سرِ مشاعرہ پڑھی کچھ اشعار ذیل میں پیش ہیں۔

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم
درندوں کے دل بھی تھے اس سے دونیم

نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر
پلنگ و نمر واں نہ رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب
شغال اور روباہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب سے ہلاک
دم اس کے نے وا کی اڑا دی تھی خاک

رہا کرتی کوسوں تلک اسکی دھوم
نہ اس راہ آتا کوئی جز سموم

⁂

خراطین و خرموش موش و شغال
اس اژدر کو کر عنس اپنی خیال

رواں ساتھ اس کے تباہ ہوئے
کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے

قضارا وہ آفت تھی سرگرم سیر
چلے آتے تھے بھاگتے وحش و طیر

وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی
ہوئی خوف سے اس پر طاری غشی

قدم غوک کے گرد کا جل گیا
بھروسہ تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا

جہاں پہلوان موش رستم معاش
لگا کرنے میدان میں بل تلاش

پراگندگی تھی اس انبوہ میں
کہ گو بچی بلا ہے بسیر کوہ میں

بھرا ایک دم ان نے دا کر دہاں
کہ پایا اس انبوہ کو نیم جاں

دم دیگر ان سے نہ کوئی رہا
وہی دشت خالی وہی اژدہا

کسھوں نے کبھی سمجھو نہ اندیشہ کیا
نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ
طرف ہوں مری ان کی قسمت ہے یہ

مری قدر کیا انکے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

جب دو ہم عصر ایک ہی حیثیت کے پیدا ہو جاتے ہیں تو ابتدا میں ان میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور بعد میں یہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش رقیبانہ چشمکوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسا ہی میر اور سودا کے ساتھ بھی ہوا، اس زمانے میں دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ اگرچہ دونوں ہی ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی مشاعروں میں ایک دوسرے پر فقرے بھی کستے تھے مگر کبھی انشاء اور مصحفی یا شرر و چکبست کی طرح معرکہ آرائی کی نوبت نہیں آئی۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

"جیسا کہ میر نے نکات الشعراء میں لکھا ہے، دونوں کو اکثر ساتھ غزلیں لکھنے کا اتفاق ہوتا تھا، یعنی مشاعرہ میں ایک ہی طرح میں غزلیں سناتے تھے، یہ گویا ایک طرح کا خاموش معرکہ تھا، یہاں زبان درازی، تو تو میں میں بحث و تمحیص نہیں تھی نہ بات بات پر تلواریں میان سے نکلتی تھی، مگر دونوں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ اور دونوں کا درجہ حاصل ہو جاتا تھا، چند ایسے اشعار سنئے تو آپ خود فیصلہ کرلیں گے کہ دونوں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں، گو روح تغزل میر کے یہاں زیادہ ہے۔

ادب دیا ہے ہاتھ سے اپنے بھلا کبھی سجانے کا کیسے ہی ہم مست چلے پر سجدہ ہر ہر گام کیا (سودا)
سر زد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا (میر)
بجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے (سودا)

گلزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں　　کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے۔ (میرؔ)

لالہ سری رام نے سوداؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے خمخانہ جاوید میں لکھا ہے کہ میرؔ

سوز میر درد و میر تقی سے سوداؔ کی معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

مولف شعر الہند لکھتے ہیں کہ قدما کے اس دور میں جس میں کہ میر مرزا

تھے اگرچہ ایک ہی درجہ کے اساتذہ موجود تھے لیکن ان میں صرف میر مرزا حریف

مقابل تسلیم کئے گئے اور ان کی شاعری کا موازنہ و مقابلہ اردو شاعری کی تاریخ

کا ایک لازمی جز ہو گیا۔ لیکن تاریخی حیثیت سے صحیح طور پر یہ معلوم نہیں

ہوتا کہ دونوں حضرات کب حریفانہ حیثیت سے اکھاڑے میں اترے۔ یہ

یقینی ہے کہ ایک زمانے تک دونوں میں اتحاد رہا اور میرؔ صاحب سوداؔ کو

اپنا شریک فن سمجھتے رہے۔ فرماتے ہیں۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی

گیا سو میرؔ دیوانہ رہا سوداؔ سو مستانہ

یہی حال سوداؔ کا بھی تھا جو ایک منظوم حکایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے　　کہوں میں کس سے کہ با وصف اتحاد تمام

لکھا نہ پرچۂ کاغذ بھی اتنی مدت میں　　کہ بیقرار دل بیتاب ہوئے موجب آرام

میرے نزدیک لالہ سری رام کی مراد معرکہ آرائیوں سے مشاعروں کی

صحبتیں ہیں جن میں درد، سودا، میر اور میر سوز اپنا کلام سناتے تھے۔ (۱)

قیام دہلی تک سودا اور میر میں مشاعروں وغیرہ میں معمولی نوک

جھونک ہوتی رہی لیکن جب دہلی میں تباہی و بربادی کا بازار گرم ہوا تو دوسرے

---

(۱) بحوالہ اردو کے ادبی معرکے از عہد سوداؔ تا چکبست و شرر، مرتبہ امیر حسن نورانی۔ ص ۲۰ - ۱۹۔

شعراء کی طرح سودا اور میر نے بھی لکھنؤ کا رخ کیا۔ دہلی میں وہ جب تک رہے حدِ ادب قائم رہی لیکن لکھنؤ پہنچ کر یہ سب باتیں ختم ہو گئیں اور دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے اور معمولی معمولی نوک جھونک نے باقاعدہ ہجو کا انداز اختیار کر لیا۔

سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا لیکن میر اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے میر نے سگ پرستی کی مذمت میں بھی ایک ہجویہ مثنوی لکھی جس کا نام انھوں نے سودا کی رعایت سے "ہجو عاقل نام کہ کے بسگاں اُن بے تمام داشت" رکھا۔ سودا کے کتوں کا شوق ملاحظہ کیجئے۔

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں ۔۔۔ گھستے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں
آیا جو ایک روز وہ بے تہہ چلا ہوا ۔۔۔ کتا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا
یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا ۔۔۔ پھر کھول اس کے منھ کے تئیں چومنے لگا
ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس ۔۔۔ گردن میں اپنی ڈالے پھرے وہ سبد مرس[1]

اگرچہ میر کو بھی پالتو جانور دل سے محبت اور انسیت تھی لیکن کتا مذہبی اعتبار سے نجس العین سمجھا جاتا ہے اس لئے بھی میر نے اسے اخلاقی عیب قرار دیا ہے کتوں کی اتنی شدت سے مذمت کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ کتوں نے میر کو سفرِ جعفر

---

[1] ایک قطعہ میں بھی میر نے سودا کی اس خصلت پر طنز کیا ہے۔

کتوں کے لے کے زرد سیاہ و سفید پشم ۔۔۔ کس کس طرح سے دیکھتا ہے داب داب چشم
دلی میں تین کتیاں کہیں سے کے پالیاں ۔۔۔ ہمسایوں کی جھقوں کے لئے رکھائیں گالیاں
وے مر گئیں تو دیر رہا روتا غم زدہ ۔۔۔ پستی کے پیچھے پھر نہ چلنا تک ستم زدہ
لونگی کا گرم غم جو رہا سو کو فسخ ہوا ۔۔۔ برفی کی تعزیت میں سگ روئے یخ ہوا

پستی، لونگی، برفی، سودا کی کتیوں کے نام ہیں۔

ہیں ہر جگہ پریشاں کیا تھا۔

انساں کو انس کتے سے اتنا ہوا کہ کب ۔۔۔ ناپاک اس کو جانیں ہیں پاکیزہ لوگ کب
پاکیزگی طبع لطافت وہ ہر طرف ۔۔۔ کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف
یا چھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی ۔۔۔ یا کتوں سے چٹاتا ہے اب اپنے منھ کو بھی
بلی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی ۔۔۔ آئین میں اس کی دوستی ایماں کے ساتھ تھی
واں کے لوگ ہوں کہ ہوں اہل اصفہاں ۔۔۔ کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیاں کے ہاں

بہرحال کتا اسلامی نقطہ نظر سے ایک ناپاک جانور ہے اور آج بھی مسلمان اسے نجس العین تصور کرتے ہیں۔ اس مثنوی میں میر نے اگرچہ کہیں بھی سودا کا نام نہیں لیا ہے لیکن اشعار بتاتے ہیں کہ یہ سراسر سودا کی ہجو ہے۔

سودا بھلا کیوں کر خاموش رہ سکتے تھے انھوں نے بھی ایک مخمس "در ہجو طعن میر تقی میر کہ فی الحقیقت میر شنیع بودہ است" لکھ کر میر کی مذمت کی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اکثر تو مرے خبیث کہتا ہے یہ بات ۔۔۔ کتوں میں فلانے کی شب و روز ہے اوقات
خود اس کی نجاست کا نہیں کتے پہ اثبات ۔۔۔ لازم ہے مسلماں نہ کرے اس سے ملاقات
پر چاہئے صحبت سے رکھے ایسے کی اکراہ

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں: "میر اور سودا کی معرکہ آرائی شروع میں تو حد ادب میں رہی مگر آخر میں بے ادبی تک پہنچ گئی۔ دہلی کی فضا میں دونوں مقابلہ اور حریفانہ چشمک سے آگے نہ بڑھے۔ لکھنؤ کے ماحول میں ایک دوسرے کی ہجو سے بھی باز نہ رہے۔ اگر سعادت علی خاں ناصر کا بیان صحیح ہے تو میر کے بڑھاپے کی شادی ضرور دوستوں کی تفریح کا باعث ہوئی ہوگی۔ سودا، میر سے پہلے انتقال کر گئے مگر میر کی عمر نواسی نوے سال کی ہوئی۔ اس لیے سودا کی

زندگی میں بھی اگر میر کی شادی ہوئی تھی تو کمان کبر سنی میں۔ اس لئے اس سے بعید ہجو قرین قیاس ہے۔ مگر سودا کو کیتوں سے جو دلچسپی تھی اس کے پیش نظر میر کی ہجو اور سودا کے جواب میں شبہ نہیں اور یہ بات ثابت ہو کہ آخر میں دونوں استاد ایک دوسرے کو بھی بخشنے کے لئے تیار نہ تھے۔ [1]

انھوں نے اپنی ایک مثنوی "در ہجو شخصے ہیچمدان کہ دعوی ہمہ دانی داشت عرف زم الفضول" میں تمام ہناد خود ساختہ علما پر بھی طنز کے نشتر بکھیرے ہیں۔ اس سے اس زمانے کے علمی ماحول پر روشنی پڑتی ہے کہ لوگ اپنی ہیچمدانی پر اپنے آپ کو قابل سمجھنے لگتے تھے۔ اور ایسے لوگ بہر حال ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ اس میں بھی ایک شخص ہے جو اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے حالانکہ اسے کچھ نہیں آتا۔ اس سے اس کا شاگرد علم تاریخ علم بیان اور جغرافیہ وغیرہ سے متعلق مختلف سوالات کرتا ہے جن کے وہ عجیب مضحکہ خیز جواب دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خواہ مخواہ اپنے کو عالم کہنے لگے تھے۔ یہاں اس کا ایک دلچسپ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس عالم سے تجنیس کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے اس طرح جواب دیا۔

تجنیس کا سوال کیا اس سے ایک روز   کہنے لگا اس اسپ کو کہتے ہیں جو ہو بوز
نادان تو نے اسپ مجنس نہیں سنا   مشتق اسی سے جانے ہے جو ہے پڑھا گنا
لاتے جہاں ہیں شعر میں تجنیس شاعران   مذکور اس سے ہوتے ہیں گھوڑوں کے وصف وان

اس طرح بحر رمل کے متعلق کیا جواب دیتا ہے یہ بھی سنئے۔

میں نے کہا کہ کہتے ہیں تم کو عروضدان   بحر رمل کی مجھ سے حقیقت کرو بیان

---

[1] اردو کے ادبی معرکے از عہد سودا تا شرر و چکبست: مرتبہ امیر حسن نورانی ص ۳۶۔

بولا کہ تیری عقل سے آتا ہے بس عجب   دریا ایک نام ہے پھر کیا کہوں سبب
تشریح میں بھی ایک تھا وہ تلخ بے مثال   ہر استخوان کو کہنے لگے نیم کی ہے چھال

ان سوالات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پڑھے لکھے آدمی سے کون کون علم جاننے کی توقع کی جاتی تھی۔

(۴) توہمات

میر کے زمانے میں توہم پرستی کا عام رواج تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں: "ہر طرف ضعیف الاعتقادی کا زور تھا اور گنڈے تعویز، منتیں، مرادیں، عرس، اور قوالیاں اور اوراد و وظائف کا چرچا تھا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ انحطاط پذیر دہلی کے لوگوں میں عمل کی طاقت سلب ہوگئی تھی، تعیش پسندی نے ان کے ذہنوں کو متاثر کیا تھا۔ اور ان کی شخصیتوں کو محنت اور ضابطہ بندی کی عادت سے دور کر دیا تھا۔ عمل سے بیگانہ ہو کر وہ اب اپنے مسائل کا حل اپنے قوت بازو کے ذریعے تلاش کرنے کے بجائے کسی غیبی قوت کے سہارے معجزہ یا کرامات میں ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی ایک نظام حیات کی ضرورت تھی جو ان کے اس فکری اور جذباتی تضاد کو ہم آہنگ کر سکے جو ایک طرف ان کی عیش پسندی، رنگینی، زندہ دلی، شاہد بازی اور دوسری طرف ان کی مذہبیت یعنی اسلام پر اعتقاد کی شکل میں نمایاں تھا۔ چنانچہ تصوف کے ذریعہ انھوں نے مذہبیت یعنی اسلام پر قائم رہتے ہوئے رنگینی، رندی اور شاہد بازی کے جذبے کی تسکین کے لیے راستہ نکال لیا اور تصوف کے ذریعہ انھوں نے موسیقی عشق مجازی اور رنگ طبعی کی ساری لذتیں حاصل کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔"[1]

میر کی مثنویوں میں بھی اس زمانے کی توہم پرستانہ ذہنیت کا عکس کافی حد

---

[1] دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر۔ ص ۹۵۔

حک نمایاں ہے۔ مثلاً

برسوں یار آ دیگی یہ پاکیزہ خو — آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو
لگے ہو جو گھر سے جاتے قادر ہجو — ٹیکا ہو کبھو تو کچھ کہوں دشمنی دگر

اس سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں چلتے ہوئے اچانک بلّی کا سامنے آجانا یا اس کا چھینک دینا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اسے فال بد سمجھتے ہیں۔ تو ہم پرستی کی ایک اور مثال ہم جب دیکھتے ہیں جب کہ موہنی کے بچے چھوٹی عمروں میں ہی ختم ہو جاتے ہیں تو بچوں کی حفاظت کے لئے نذریں مانی جاتی ہیں۔ نقش لائے جاتے ہیں اور انھیں نیلے ڈوروں میں باندھ کر بلّی کے پیٹ پر باندھا جاتا ہے۔ چھیچھڑوں پر افسون لکھے جاتے ہیں۔ ماش کی موٹی روٹیاں پکائی جاتی ہیں اور گوشت کی بوٹیاں چیلوں کو کھلائی جاتی ہیں۔

متصل ایسا ہوا جب اتفاق — مرگ ان بچوں کی گذری سب پہ شاق
حفظ اس کی کو کبھی کا لازم ہوا — جھاڑ پھونکے کا ہر اک عازم ہوا
نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈ کر — نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر
چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے — بعضوں نے تعویذے کرخوں لکھے
بی بلائی سے بہت کی التجا — گریۂ محراب سے چاہی دعا
گوشت کی چیلوں کو پھینکی بوٹیاں — ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
لڑکیاں بٹھلائی یاں کھاٹوں تلے — اس طرح جوں دبکی بلّی کم ہلے
صدقے اترے چھیچھڑے جوڑے ڈھیر ڈھیر — گربہ لادہ نے کھائے ہو کے سیر
کیں مناجاتیں ولی شب لاتعد — گربہ زاہد سے بھی چاہی مدد
بو ہریرہ کے تئیں مانا بہت — بلّیوں کے تئیں دیا کھانا بہت

خواجہ عصمت کرتے تھے طاعت جہاں — ایک بلی بیٹھی تھی آکر وہاں
صبح دم ہوتی وہی گرم سجود — گہہ قیام اس کے تئیں تھا گہہ قعود
چاہی ہمت اس سے اٹھ کر ہر سحر — کچھ تو باطن نے کیا اس کے اثر
پانچ بچے اس نے اس نوبت دیئے — پارسے سب وہ قدرت حق سے جیے
کیوں نہ ایسی ہووے امداد سترگ — بی بلائی بو ہریرہ سب بزرگ
اک توجہ رکھتے تھے ظاہر کی اور — آرزو بر لائے یہ باطن کے زور

جھاڑ پھونک اور نذریں ماننے کا عام رواج تھا اور کم و بیش ہر شخص اس پر عقیدہ رکھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صدقہ دینے مناجاتیں پڑھنے اور خیرات دینے سے بلایات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ بچے کو چشم بد سے بچانے کے لئے عموماً نیلے دھاگے گردن میں ڈالے جاتے ہیں۔

موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام — پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح و شام
نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے — لوگ آنکھوں میں ہی رہتے ہیں کھڑے

بظاہر یہ باتیں موہنی بلی کے سلسلے میں ہیں لیکن اس سے اس زمانے کے لوگوں کی توہم پرستانہ ذہنیت کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لئے نہ صرف جانوروں بلکہ انسانوں کے، بچوں کے گلے میں بھی تعویز اور گنڈے پڑتے ہوں گے۔ ایک طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود اس قسم کے اعتقادات کا پرتو آج بھی دیہات و قصبات میں مل جاتا ہے۔

بیماری دور کرنے اور صحت و تندرستی کو واپس لانے کے لئے بھی افسوں پڑھے جاتے اور تعویز باندھے جاتے تھے۔ چنانچہ جب میر بیمار ہوئے ہیں تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

رہوں زرد میں گاہ بیمار سا — پریشان سخن گہہ پہ بیدار سا

پری خوان کو لا کوئی افسون پڑھائے کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے
(مثنوی خواب و خیال)

اس کے علاوہ جب کوئی گھر سے جاتا تھا تو اس کو رخصت کر کے آئینہ پر پانی ڈالا جاتا تھا۔ تاکہ جانے والا سلامتی خیریت کے پھر واپس آئے۔ میر کے والد ایک مرتبہ جب عالم استغراق میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے تو ان کی دایہ نے بھی آئینہ پر پانی ڈال کر شگون نکالا تھا۔ اسی طرح میر کی محبوبہ جب ان سے رخصت ہو جاتی ہیں تو میر بھی آئینہ پر پانی ڈال کر شگون نکالتے ہیں۔

آخر کر کے خدا کے حوالہ آئینہ پر پانی ڈالا
تاکہ ہر دکھلائے شتابی راہ دور سے آوے شتابی
(مثنوی جوش عشق)

اخلاقی حالت

میر کے زمانے میں نہ تو سیاسی سماجی حالات اچھے تھے اور نہ معاشی نظام بہتر، اخلاقی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ دروغ گوئی عام تھی۔ حکام میں عمل کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ وہ عوام کے کاموں میں تغافل برتتے اور انھیں جھوٹے وعدوں سے تسلی دیتے اور ستاتے تھے۔ میر بھی اس کی شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے شیوہ یہی سبھوں کو یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
(مثنوی دریان کذب)

میر کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہمیشہ فتنہ و فساد برپا کرتا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو زندان میں رہنا پڑا اور کوہکن کو بھی اس جھوٹ کی

وجہ سے موت کا مزہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح جھوٹ کی مذمت کے بعد انھوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والی بدمعاملگیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرنے اپنی تنخواہ کی فرد دستخطی کسی دوسرے شخص کو دے دی تھی لیکن وہ آج کل آج کل کرکے ٹالتا رہا اور میر کا کام نہیں ہو سکا۔ میرنے اس فرد دستخطی کا تذکرہ اپنے ایک مخمس میں بھی کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس شخص کا نام جس سے انھوں نے فرد دستخطی جاری کرنے کے لئے کہا تھا بلاس رائے تھا اور یہ فرد دستخطی صرف آٹھ آنے کی تھی۔

اس سے جہاں میر کی غربت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں جھوٹ کے دور دورے اور دفتری نظام کی بدانتظامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس عہد میں سلاطین و وزراء اور عوام کا بھی یہی شیوہ بن جاتا ہے۔ تو وہاں اس قسم کی افراتفری اور بدانتظامیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں حاکم اور اس کے عملہ کا کیا حال تھا دیکھیے۔

سردار جس سے سب متعلق ہے کاروبار ۔۔۔ سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار
پھر سب مدار کار دروغی و مفتری ۔۔۔ صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

(مثنوی در بیان کذب)

سماج میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود تھے جو بغیر گالی کے کوئی بات نہیں کرتے تھے مثلاً میر نے جب ننسنگ نامی گاؤں کا سفر کیا تو انھیں راستہ میں ایسے بھی لوگوں سے سابقہ پڑا۔

نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم ۔۔۔ اس پر ستید امام واں کی قوم
بنلے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی ۔۔۔ اس طریقہ سے آشنا نہ کوئی
راہ و رسم و طریق سب بے ڈھب ۔۔۔ پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب
کوسوں بھاگا اگر ملا کوئی ۔۔۔ صحبت ایسوں سے رکھے کیا کوئی

ایک تکیہ نہ جس میں فرش نہ گاہ ‏ حال درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو ‏ مرض جو لا علاج اس کو
برسوں چلا کے نا امید ہوا ‏ چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آنے جانے سے ان نے جو پایا ‏ اسی پر رہ گیا وہی کھایا

اگرچہ اخلاقی حالت بہت حد تک گر چکی تھی تاہم اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کا اخلاق بہت بلند تھا وہ اپنے مذہب کے پابند تھے واجبات پابندی سے ادا کرتے تھے۔ میر کی بعض مثنویوں میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً مثنوی عشقیہ کے میرد کا کردار اس زمانے کے بلند اخلاق کی اعلیٰ مثال ہے۔

رہے محو پاکیزگی و صلوٰۃ ‏ نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات
زباں نرم طالع دری و صلاح ‏ نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح
خوش اندام خوش رو و پاکیزہ خو ‏ کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو

مندرجہ ذیل اشعار اگرچہ میر نے موہنی کے دونوں بچوں مانی اور منی کے لئے لکھے ہیں لیکن ان سے اس زمانے کے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی نیک خصلتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار ‏ رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میری اس کی خوابگاہ ‏ دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ
میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے ‏ جان پاوے سن مری آواز پائے

تصور حیات

میر کے زمانے میں زندگی کے دو تصور موجود تھے۔ ایک تو عیش و عشرت کی زندگی جس کا تعلق (ہم کہہ سکتے ہیں کہ) لکھنؤ سے ہے کیوں وہاں دہلی کے مقابلے میں کافی خوش حالی تھی

دولت و ثروت کی کمی نہ تھی اور دولت کی فراوانی نے وہاں کے لوگوں کو بے فکری میں مبتلا کر دیا تھا۔ چنانچہ عیش و عشرت اور فراغت نے لکھنؤ کی فضا کو مجموعی طور پر رنگین بنا دیا تھا لیکن اس کے برعکس دہلی کی حالت سیاسی اور معاشی دونوں اعتبار سے اچھی نہ تھی۔ اس لئے یہاں کی زندگی میں درد و کرب نمایاں تھا۔

میر کا تعلق لکھنؤ کے مقابلہ میں دہلی سے زیادہ رہا۔ نا مساعد حالات سے تنگ آکر اکثر شعراء نے تصوف کے دامن میں پناہ لی۔ میر خود تو صوفی نہ تھے لیکن ان کی آنکھوں نے حکومتوں کا عروج و زوال دیکھا تھا۔ حاکمان وقت کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھی تھیں۔ خود میر کو بھی بہت سے جبر کے سہنے پڑے تھے۔ حوادث پیہم نے انھیں دنیا کی بے ثباتی کا درس دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں تو اس درد کی کسک موجود ہے ہی لیکن بعض مثنویوں میں بھی یہ جذبہ شدید ہو گیا ہے۔ ان کی مثنوی "در مذمت دنیا" سے جہاں ایک طرف میر کے بڑھاپے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے وہاں اس سماج کے بعض ایسے افراد پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس دنیا کے عیش و آرام کو لافانی سمجھ کر رنگ رلیوں میں مگن تھے۔ یہ مثنوی ایسے لوگوں کے لئے ایک اچھی نصیحت ہے۔ انھوں نے دنیا کی بے ثباتی پر اثر انداز میں بیان کی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں فلسفہ کم اور زندگی کے تجربات سے اخذ شدہ نتائج زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل — کہ اس کاروان گہہ سے کرنا ہے نقل
میسر ہے سشہ ہے کہ درویش ہے — سبھوں کو یہی راہ در پیش ہے
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش — یہ منزل نہیں جائے بود و باش
نہ جدول رہے گی نہ سرو روان — گلستاں کو پاویں گے ہو کا مکان

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب ۔ نہیں جانئے باش اور جا ہے عجب

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں: "میر صوفی منش تھے صوفی نہ تھے اس لیے دنیا کی ناپائیداری کی یہ رنگینی ان کے یہاں زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ میر کو قنوطی کہا جاتا ہے مگر زندگی کی لذت اور رنگینی سے میر کو انکار نہیں ۔ انھیں حسرت ہے تو یہ ہے کہ بقول عرفی تو آسمانوں کی اس وسعت میں ایک ذرّہ کے لئے جی کھول کر رقص کرنے کی گنجائش نہ نکل سکی۔ ان کے ہاں درد عکس نشاط اور آرزوئے انبساط ہے۔ وہ دنیا کو لذت وکیف سے خالی نہیں پاتے۔ ہاں اس کیف کو ناپائیدار اور اس دنیا کو بے بنیاد ضرور پاتے ہیں۔ اور اس کی بے ثباتی کا داغ دل پر لیتے ہیں یہ تصور اس دور کے سبھی شعراء کے ہاں ملتا ہے۔ ان سبھی نے اپنے دور کی تہذیب کو دنیا اور زندگی سمجھا اور جب اس تہذیب کا زوال نظر آتا ہے تو اس تہذیب کے خاتمہ کا نہیں بلکہ دنیا کی بے ثباتی کا ماتم کرنے لگتے ہیں۔" [1]

زندگی کا دوسرا رخ آصف الدولہ کی شادی اور رہوعی کی رنگ رلیوں میں نظر آتا ہے۔ جو اس زمانے کے لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی عیش پرستانہ زندگی کی کھلی ہوئی تصویریں ہیں۔ جن کا ذکر ہم رسم و رواج کے سلسلے میں اوپر کر چکے ہیں۔

میر کی شاعری میں سیاسی سماجی اور معاشی حالات کا عکس

میر کی بعض مثنویوں سے اس زمانے کے سماجی سیاسی اور معاشی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً مثنوی "تسنگ نامہ" اس زمانے کی یاد دلاتی ہے جب دہلی کے حالات

---

[1] دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر۔ ص ۳۱۴-۳۱۵ ۔

ناسازگار ہونے کی وجہ سے اہل کمال کو اسے خیرباد کہنا پڑا تھا۔ میر نے بھی یہاں کے حالات سے پریشان ہو کر اس دلی کو جسے وہ بجا طور پر اوراق مصور سے تعبیر کرتے تھے خیرباد کہا اور مع اہل بیت اور ساز و سامان کے ایک رئیس کے ہمراہ نکل کھڑے ہوئے۔ بارش کی وجہ سے راستے خراب تھے، ندی میں بھی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ آخر کار ناؤ میں بیٹھ کر کسی طرح ندی پار کی اور شاہدرہ پہنچے میر نے ایک بوسیدہ سرائے میں قیام کیا وہاں کی بھٹیاری بہت خوش ہوئی کہ اب اسے بھی کچھ ملے گا لیکن جب میر نے اسے بتایا کہ وہ جس رئیس کے ہمراہ آئے ہیں انہیں سے کھانے کا انتظام بھی ہوگا تو وہ بہت دل شکستہ ہوئی۔

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے   چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھا دیں گے کچھ کھلا دیں گے   ہم کچھ ان کے سبب سے پا دیں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم   ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

لیکن میر نے اسے راضی کر لیا اس کے بعد غازی آباد کے لئے قافلہ روانہ ہوا یہاں بھی میر کو ایک سرائے میں قیام کرنا پڑا۔ دوران سفر میر کی عزیز ترین بلی موہنی کہیں کھو گئی۔ میر کو اس بات کا دکھ ہوا۔ اس کے بعد قافلے نے بیگم آباد اور پھر میرٹھ کی طرف کوچ کیا۔ میرٹھ سے جب روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک گڑھی پڑی جہاں کے باشندے اچھے نہیں تھے۔ دوکاندار بے ایمان اور عوام کنگال تھے۔ اس پر ستم یہ کہ زمینداروں کی باہمی نااتفاقی نے ماحول کو اور بھی خراب کر دیا تھا۔ یہ علاقہ سکھوں کا تھا جس کی وجہ سے ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا۔

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا   کیوں کہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آ جانے تو قیامت تھی   مال و جان غرض سب کی رخصت تھی

ان سب باتوں کا میر پر اتنا اثر ہوا کہ بیمار ہو گئے۔ اس مثنوی سے بادشاہ کی مفلوک الحالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نام بے نوائی کے لئے ضرب المثل بن چکا تھا۔

اس مثنوی سے جہاں میرٹھ کے مکانوں کی خستہ حالی اور بنیوں کی قرض خواہی پر روشنی پڑتی ہے وہاں غذا کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے۔ گوشت نایاب تھا، آٹا کرکرا ہوتا تھا۔ گول کدو، بھنڈی، بیگن، اروی اور توری بھی مشکل سے ملتی تھیں جو معاشی بدحالی کا نتیجہ تھا۔

اس گڑھی کی خستہ حالی ملاحظہ ہو جس میں میر نے قیام کیا تھا۔

ایک گڑھی بود و باش کو پائی	کچھ نہ کھانے کو جس میں دکھائی
چھوٹی چھوٹی سی چار دیواری	اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا	ہر قدم ایک غار و چقر تھا
کھنڈرے اس میں تین چار مکان	جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان
باد جنگل کی تند کچھ نہ رکاؤ	مینہ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ
گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام	تس میں لا ع جانور اقسام
جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس	کاٹ کھاویں تو چھلو دو دو بانس
ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے	شب گزوں سے بدن جلے جاتے
ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے۔	مرچ جد وار پھر لگانا ہے

بستی کی ویرانی کی وجہ سے کتوں کی کثرت تھی وہاں کے لوگوں کے چہرے بھیانک کالے اور سوکھے سے تھے۔ زیادہ تر دھنیوں کی آبادی تھی۔ حالت اتنی خراب تھی کہ بنیوں اور بقالوں کی دکانوں میں بھی سامان خورد و نوش نہیں تھا۔ بس کچھ دال آٹا اور ساتواں چنے تھے۔ مرچ ادرک بھی عنقا تھا

ہلدی کی جگہ زرد مٹی، لونگ چورا کی جگہ لال مرچیں کٹی ہوئی اور دھنیا میں کنکر ملا کر عوام کو بے وقوف بنایا جاتا تھا۔ اور ان کی کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ مسجدیں ویران تھیں وہاں نہ خطیب تھے نہ مؤذن۔ تمام عوام گمراہی کا شکار تھے۔ یہاں تک کہ سید بھی صوم و صلوٰۃ کے پابند نہ تھے۔ مثنوی کے جستہ جستہ اشعار پیش ہیں۔

آدمی کی معاش ہو کیوں کر — کتوں میں بود و باش ہو کیونکر
بستی دیکھی تو ایسی تھی آباد — کہ بیابان سخت سے دے باد
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے — سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں — زرد رو ہو گئے ہیں لب بے ناں
اور جو چار گھر نظر آئے — ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کوئی چمار تھے کوئی — فاقوں کے زیر بار تھے کوئی
صورتیں کال سوکھے سوکھے سے — سارے کنگال اور بھوکے سے
اور آگے گئے تو تھا بازار — اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک دوکان تھی پساری کی — ان نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی — زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے — بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں — میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
ان میں دو دانے اور سب کنکر — دے کاغذ میں ہاتھ لمبا کر
لونگ چورا نفر سے منگوایا — لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کر لے قیاس — آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس

میر کی بعض مثنویوں سے ان کی مفلسی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی غربت اور فلاکت کا صحیح اندازہ ہم ان کی اس مثنوی سے کر سکتے ہیں جو انھوں نے

اپنے گھر کی ہجو میں لکھی ہے۔ گو میر نے یہ مثنوی اپنے حال پر لکھی ہے۔ لیکن اس سے عوام کی فلاکت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اب ذرا میر کے گھر کی خستہ حالی دیکھئے۔ میر جس طرح اس گھر میں رہتے ہوں گے وہ انھیں کا دل جانتا ہوگا ہم تو صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ کس تنگی سے وہ اس میں بسر کرتے ہوں گے۔ میر جس گھر میں رہتے تھے اس کا صحن بہت چھوٹا تھا کمرے تنگ تھے۔ دیواریں خستہ اور جھکی ہوئی تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا کا تیز جھونکا منٹوں میں انھیں گرا دے گا۔ اور اس خستگی کی وجہ سے حشرات الارض بھی بہ افراط ہو گئے تھے۔

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
کوچہ موج سے بھی آنگن تنگ　　کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم　　تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　اس خرابے میں میں ہوا پامال
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگوں کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں　　پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے　　کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے　　کوئی دا سا کہیں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر　　گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا گھر چھوٹا بھی تھا اور پرانا بھی جس کا زیادہ

کیا تھا یہ مثنوی اگرچہ میر نے اپنے گھر کی ہجو میں لکھی ہے لیکن حقیقت میں یہ مثنوی
اس زمانے کی دلی اور دلی والوں کے مکانات کی بھی تصویر ہے جو زمانے کے ہاتھوں
اس قدر بے بس اور مجبور ہو گئے تھے کہ ان کی معاش بھی مشکل ہو رہی تھی۔

برسات کا موسم ہندوستان کی بہار کہلاتا ہے کئی کئی دن آسمان پر ابر چھایا
رہتا ہے اس زمانے میں اتنی کثرت سے بارش ہوتی ہے کہ گھر سے آدمی کا باہر نکلنا
دشوار ہو جاتا ہے۔ اس وقت جب بارش ہوئی تو اس گھر کا حال اور بھی بُرا ہوگیا
دیواریں پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئیں اور چھتیں چھلنی کی طرح ٹپکنے لگیں۔ کھٹمل
اور دوسرے حشرات الارض کی اور کثرت ہو گئی۔ غرض زندگی وبال جان ہو گئی۔

کیا کہے مینہ سقف چھلنی تمام — چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریے — راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے
جا نہیں بیٹھنے کو مینہ کے بیچ — ہے چکاشر سے تمام ایوان کیچ
آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب — کیونکہ پردہ رہے گا یا رب اب
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات — گھر کی دیواریں جیسے ہیں گی پات
باؤ میں کانپتی جو ہیں تھر تھر — اتنا پروڑا رکھے کوئی کیوں کر
کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے — چھوپا کا ہے کر بلکہ تھوپا ہے
اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال — پر کڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا مینا تو ایک بابت ہے — پو ندنا پھدکے تو قیامت ہے
کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار — تھرتھرا دے جھنجھیری سی دیوار
بس کہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

بوریا پھیلا کر بچھا نہ کبھو — کونے میں ہی کھڑا رہا یکسو
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی — چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
ہاتھ تکیہ پہ گہ بچھونے پر — کبھو چادر کے کونے کونے پر
توشک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی — ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل — آنکھ منہ ناک کان میں کھٹمل
کہیں پھڑکا کر جی سے تاب گئی — آنکھ سے تا پگاہ خواب گئی
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے — کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام صحت و صفائی کا زیادہ خیال نہ رکھا جا سکتا تھا۔ پہلے تو رات کی نیند کھٹملوں نے دوبھر کر رکھی تھی لیکن جب دیوار بھی گر گئی تو گھر بالکل میدان ہی ہوگیا۔ اور کتوں کو بھی پریشان کرنے کا موقع مل گیا۔

دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ — کاش جنگل میں جا کے میں بستا
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

آخر کار بارش کی شدت کی وجہ سے جب گھر کی حالت اور خراب ہوگئی اور نوبت چھتوں تک پہونچی تو یہ صلاح ٹھہری کہ یہاں سے جان بچا کر کہیں نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ ایک عزیز کے یہاں جا کر اقامت اختیار کی۔

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب — ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب
سن کے ہر اک کے جی میں ڈر آیا — خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا
گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی — سر پہ بھائی کے چار پائی تھی
بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا — اس کا سارا فگار کاندھا تھا

صف کی صف نکلی اس خرابی سے | تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے
میر جی اس طرح سے آتے ہیں | جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں
جس میں خوش یک نفس معاش کریں | طور پر اپنے بود و باش کریں

اگرچہ آج ہندوستان نے اتنی ترقی کرلی ہے لیکن اب بھی ہمیں صنعتی شہروں میں مزدوروں کی بستیوں میں اس قسم کے گھر نظر آتے ہیں جس میں نہ معلوم بے چارے کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اب بھی جب طوفان آتا ہے تو ہمارے سماج کے غریب لوگ اسی طرح اپنی حفاظت کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ مکان تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

برسات کے اس موسم کا بیان سودا، قائم اور بعد کے شعراء نے بھی کیا ہے۔ نظیر کے یہاں بھی ہے لیکن میر کی بات ہی اور ہے۔ ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کا بھی رنگ ہے۔ وہ خال خال ہی کسی اور کے ہاں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

میر کی مثنویوں کے بارے میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی رائے ہے کہ ذکر میر کے مطالعہ کے بعد ان کی یہ سوانحی مثنویاں ان کے حالات زندگی ان کے مصائب اور پریشانیوں کو سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔ اور انہیں مثنویوں سے ان کی ذہنی پراگندگی کا انکشاف بغیر ان کے مبسوط حالات پڑھے ہوئے لگتا ہے جس بے چارگی کا نقشہ انھوں نے گرتے ہوئے گھر میں پیش کیا ہے۔ کم لوگوں نے اس شرح و بسط کے ساتھ اپنے نجی حالات میں بیان کیا ہوگا۔ اگر میر کی دنیا کنج عزلت اور طبیعت حساسانہ ہوتی، تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں پر وہ اتنی گہری نظر کبھی نہ ڈال سکتے۔[1]

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں، ص ۱۲۳

مثنوی جنگ نامہ روہیلوں اور انگریزوں کی جنگ کے موقع پر تصنیف ہوئی۔ بہ
بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں رزمیہ عناصر ہوں گے لیکن ایسا
نہیں ہے۔

اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۷۹۳ء میں محمد علی خاں رام پور کے نواب
مقرر ہوئے لیکن ان کے عادات و اطوار اچھے نہ ہونے کی وجہ سے انھیں قتل کر دیا گیا۔
کمپنی کے حکام کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے رام پور پر حملہ کیا ۱۷۹۴ء
میں انگریزوں اور روہیلوں میں جنگ ہوئی۔ روہیلوں کو شکست ہوئی اور روہیلے
نواب غلام محمد نے دامن کوہ میں پناہ لی۔ آصف الدولہ کی فوجیں ابھی تلہر میں ہی
تھیں کہ ان کو فتح کی خبر ملی چنانچہ وہ بھی اس میں آکر شامل ہو گئیں اور دامن کوہ
کی طرف روانہ ہوئیں۔ دونوں کا مقابلہ ہوا۔ آخر روہیلوں نے اپنی شکست قبول
کر لی اور نواب کو قید کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔ ان کے بعد ان کے لڑکے کو مسند پر
بٹھایا۔ اس[۱۵] مثنوی کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب کے نواب رام پور آیا — ناگہاں اس طرف خدا لایا
آگئے آتا تھا بہر سیر و شکار — بازی یکسر روہیلی ہے اس بار
جمع افغان پسر تھے اس جاگہہ — لیک سارے تھے جنگ ناآگہہ
بے تہی کوستادہ پیش جنگی کر، — دانتے دے دے گرے ہراول پر
دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے — پکے پھوڑے کے رنگ پھوٹ چلے
جتھے تلواروں میں فرنگی سے — مرے مارے بہت کند صنگی سے
تھا تہور نہ یہ شجاعت تھی — ساعت جنگ یا قیامت تھی
تھے تلنگے روہیلے محو جنگ — لوتھوں سے ہو گیا تھا عرصہ تنگ
گورے کالے جدا جدا کیا تھے — دونوں مردم گیاہ سے یکجا تھے!

۱۵۔ پروفیسر گیان چند جین تذکرہ ص ۲۵۴ - ۲۵۵

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پا اس جا ۔۔۔ تھا انھوں کا جہاں ثبات پا
صاحب انگریز کے گھرے اکثر ۔۔۔ تھک گئے لڑتے مرتے ہم دیگر
تاک کر باڑھ پہلو سے ماری ۔۔۔ صف الٹ دی حریف کی ساری
مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا ۔۔۔ مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا
غارت از بس کر لشکری لائے ۔۔۔ نقشوں سے اشرفی روپے پلٹے

میر نے ایک مثنوی میں ایک بسیار خور کی مذمت بھی کی ہے۔ تہذیبوں میں طعام اور آداب طعام کو خاص اہمیت رہی ہے۔ کسی معاشرہ میں تیاری طعام پر کتنا وقت صرف کیا جاتا ہے اس سے بڑے بڑے نکتے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں تو ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں اس مثنوی سے اس زمانے کے کھانوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس قسم کے کھانے پسند کئے جاتے تھے۔ میر نے اس مثنوی میں دو پیازہ، حلیم، دلیہ، گاجروں کا قلیہ اور (آش بغرا) وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر چاروں کھانے تو آج بھی مستعمل ہیں۔ لیکن آخر الذکر کھانے کا اب رواج نہیں ہے۔

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے ۔۔۔ چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے
کیا وہ دو پیازہ کھائے ہو تازہ ۔۔۔ اک نوالا ہے کُلّا دو پیازہ
آش بغرا پہ مار بھی کھاوے ۔۔۔ اس میں گر بو غرا نکل جاوے
چار من گاجروں کا قلیہ تھا ۔۔۔ دو من دیگ بیچ دلیہ تھا

(مثنوی در ہجو اکول)

میر کی مثنوی "تسنگ نامہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ شب گز کے کاٹے کا علاج

مرچ اور جدوار تھا۔

شب گُووں سے بدن چلے جاتے ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے

مرچ جدوار بھی لگاتا ہے ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے

ان کی بعض مثنویوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پردے کا عام رواج تھا۔

کیوں کر پردہ رہے گا یارب اب آنکھیں بھرلاکے یہ کہیں ہیں سب

(مثنوی دریجو خانہ خود)

برق خرمن مہ پردے میں تھا دیکھا یکرہ پردے میں

خورشید اس دم ڈوبا جاتا جس دم برقع منھ سے اٹھاتا

(مثنوی جوش عشق)

اس کے علاوہ میر کی مثنویوں میں یہ اشارے بھی موجود ہیں کہ اس زمانے میں پان کھانے حنا لگانے اور مسّی ملنے کا عام رواج تھا۔

میر کی شخصیت میں ایک طرف تو ذاتی محرومی اور مظلومی کا احساس ہے ان کی انانیت ہے، عشق اور دیوانگی ہے۔ باپ اور چچا کے صوفیانہ تصورات اور بے نیازی کا اثر ہے۔ امرا سے تعلقات کے باوصف اپنے کو لئے دیئے رہنے کی شان ہے اور دوسری طرف انسانیت اور تہذیب جس تباہی کے دور سے گذر رہی تھی اس کا درد بھی ہے۔

ذاتی اور سماجی ماحول کی یہ تفصیلیں ہی ان کے فن کی حدود متعین کرتی ہیں۔ ان ہی میں رہ کر وہ اپنے تخیل کے طلسم سے ایک نئی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں ہم نے دیکھا کہ وہ سادہ رہ کر بھی قنوطی نہیں تھے۔ ان کا تخیل موت کے بعد محرومانِ عشق کو ابدی وصال عطا کرتا ہے۔ غزل کی طرح ان

کی مثنویوں میں بھی ان کے ماحول کی روح اپنے تمام کرب کے ساتھ موجود ہے۔ چونکہ مثنوی بالتسلسل یا بلاواسطہ شاعری کے ذیل میں آتی ہے اس لئے اس میں یہ فضا ذرا واضح طور پر نمایاں ہے۔

ان کی مثنویوں میں (اور غزلوں میں بھی) عشق جنسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ جو بڑی حد تک اس دور کی مخصوص فضا کے اثر کا نتیجہ ہے مگر چونکہ ان کے پاس ایک نظام اخلاق ہے اس لئے وہ بھی ایک تہذیبی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

عشقیہ مثنویاں

"مثنوی شعلۂ شوق"

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی — محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ — محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبت اگر کار پرداز ہو — دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبت ہے آب رخ کار دل — محبت ہے گرمیِ آزار دل
محبت عجب خواب خونریز ہے — محبت بلائے دل آویز ہے
محبت کی ہیں کار پردازیاں — کہ عاشق سے ہوتی ہیں جاں بازیاں
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل — محبت نہ ہوئے تو پتھر ہے دل
محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ — کلی کے دل تنگ میں بھی ہے چاہ
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے — محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ — محبت سے ہے تیغ دگر دن میں لاگ
محبت سے ہے انتظام جہاں — محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت سے روتے گئے یار خون — محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہ ہو — محبت سے جو ہو وہ ہرگز نہ ہو
محبت سے پروانہ آتش بجاں — محبت سے بلبل ہے گرم فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز — اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز
محبت ہی ہے تحت سے تا بفوق — زمیں آسمان سب ہیں لبریز شوق
محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد — دلوں میں محبت سے اٹھتے ہیں درد
گیا قیس ناشاد اس عشق میں — گئی جان فرہاد اس عشق میں
ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ — کیا اس سے لیلیٰ نے جامہ سیاہ
سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا — نل اس عشق میں کس طرح سے موا
جو عذرا پہ گذرا سو مشہور ہے — دمن کا بھی احوال مذکور ہے
ستم اس بلا کے ہیں سہتے گئے — سب اس عشق کو عشق کہتے گئے
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں — یہی ذرے کی جان نومید میں
اسی سے دل ماہ ہے داغ دار — کتاں کا جگر ہے سراسر فگار
نئے اس کے چرچے حکایت سنی — گئے شکر گاہ سے شکایت سنی
اسی سے قیامت ہے ہر چار در — اسی فتنہ گر سے ہے عالم میں شور
کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں — نہ ہو اس سے آشوب محشر عیاں
کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی — کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی
زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار — غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصہ

عجب کام پہنچے ہیں اس سے ہوا
عجب اہل عالم کو تب سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پریسرام نام
خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اس کی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز
قدم بوسی کو آتی عمر دراز

جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو
قیامت ادھر سے نمودار ہو

نگہہ گرم اس کی جدھر جا لڑی
کہے ناگہ ادھر کو بجلی پڑی

وے کافر بھویں ہو دیں قبلہ جہاں
کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں

نگہہ تیغ مجروح جس کے پڑے
پلک سیل جوں دل میں جا کر گڑے

سیہ چشم اس کے دو بدمست تھے
نگاہوں نے شمشیر در دست تھے

رخ اس کا کہاں اور مہ نور کہاں
تفاوت زمیں آسماں کا ہے یاں

وہ لب لعل کو جن سے شرمندگی
دم حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجیے
تو آگے سخن مختصر کیجیے

نہ ہم تم رہیں دیکھ حیراں رہیں
سبھی دست زیر زنخداں رہیں

سراپا میں اس کے جدھر دیکھیے
وہیں روئے مقصود جاں دیکھیے

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے
قیامت تھی واں نالہ و آہ سے

فدا اس پہ جی جان ہر ایک کا
کہ مقصود دل تھا بد و نیک کا

کئی گرد و پیش اس کے وارفتگاں
کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں

بہت رفتگان ادائے کلام
بہت مبتلائے بلائے خرام

کوئی کشتۂ شوق رفتار کا
کوئی نیم جاں ذوق دیدار کا

کوئی والۂ خندۂ برق وش
کسو کے تئیں جنبش لب سے غش

کسو کی نظر میں کمر کی لچک کسو کے جگر میں پلک کی کسک
کئی حیرتی طرز گفتار کے کئی آرزو کش تھے پرکار کے
کوئی زلف سے اس کی مجنون رہے کسو کا تبسم سے دل خوں رہے
کوئی دل ستم کشتۂ اک نگاہ کوئی جان ہونٹھوں پہ موقوف آہ
کسو پر فسوں گردش چشم کا کسو پر غضب غمزہ و خشم کا
کوئی پابست بر دل کوئی بے قرار کوئی بے خبر کوئی بے اختیار
انھوں میں سے اک عاشق زار تھا اس آفت کو اس سے سروکار تھا
محبت میں تھا جذب کامل اسے مراد دل اپنی تھی حاصل اسے
شب و روز ہم بستر کام دل ہمیشہ ہم آغوش آرام دل
دم اس کے میں یاں تک تو تاثیر تھی کہ صحبت اس آتش سے دل گیر تھی
بہم ربط چسپاں بہم اختلاط نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط
مبادا کوئی غم سے کوئی ہو ہلاک وہ تا شعلہ اسی خس سے رکھتا تپاک
کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس یہ سنئے کہ ہے گا خلاف قیاس
بہت سے بہت اس کا مالوف تھا اسی کی تسلی سے مصروف تھا
کہ ناگہہ وہ دل بر ہوا کد خدا رہا اپنے عاشق سے چندے جدا
زن و شو سے اخلاص باہم ہوا اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں سخن سے وفائیں تراوش کریں
ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر کہ دشوار اٹھے ہمدگر سے نظر
رہیں دونوں دست و بغل روز و شب کبھو منھ پہ منھ ہو کبھو لب پہ لب
وفا نے جو تکلیف کی ایک روز گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز
کئی دن میں جا کر جو اس سے ملا کیا اس نے حد سے زیادہ گلا

کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا | کہ تو حال سے میرے غافل رہا
مگر سدِّ رہ تھا کسو کا فریب | ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب
کوئی زلف زنجیر پا ہو گئی | کہ مسدود راہ وفا ہو گئی
طرح کس کی چتون کی دل میں کبھی | جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی
کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا | مرے جام عشرت کو لوہو کیا
کہا ان نے تھی کد خدائی مری | نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
رکھو اب مجھ کو معذور ناچار ہوں | محبت کا میں تو گرفتار ہوں
نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام | طرف اس کے ہیں دل کو میل تمام
اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے | دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
اسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی | وہ رہتی ہے بے طاقت عاشقی
نہیں اس کو یک لحظہ تاب فراق | جدائی مری اس پہ گذرے ہے شاق
نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن | تو پاتا ہوں جا کر اسے نیم جان
نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ | وہیں جی سے اپنے گذر جاوے وہ
جو پہنچے مری جھوٹھ اسے بد خبر | تو کر بیٹھے سچ اپنے جی کا ضرر
غرض اس کو تاب و تحمل نہیں | شکیبائی ہجر بالکل نہیں
یہ سن کر کہا اس دل افگار نے | ستم کشتۂ دوری یار نے
کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول | یہ مکر زناں ہیں تو ان پر نہ بھول
وفا کن نے ان ناقصوں میں سے کی | ہوا شوے کس کا کہ وہ پھر نہ جی
بہ ظاہر میں ہر چند ہوں رشک ماہ | ولیکن ہیں باطن میں مار سیاہ
خدا مکر سے ان کے دے ہے خبر | نہیں ان سے کوئی فریبندہ تر
جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے | زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جا اس کے گھر

کہے غرق دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقت سحر
سو ڈوبا وہ خورشید روشن گہر

گیا موج دریا کے سر سے گذار
اٹھا طبع نازک سے اس کے غبار

وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب
سو اب موج دریا کو ہے پیچ و تاب

پھریں تھیں جو وے انکھڑیاں آب میں
سو وے گردشیں اب ہیں گرداب میں

تمنائیں تھے جس کے سب دل فگار
سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار

نہ سمجھا وہ نافہم اسرار عشق
نہ سوچا وہ ناتجربہ کار عشق

کہا غرق دریا ہوا پرسرام
ہوا کام اس رشک مہ کا تمام

کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار
کہ دست و بغل ہو گئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب
کہ گویا اوپر آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے
کہ حال [illegible] شور ہے

گرے ہیں کئی آشنا آب میں
کئی آتش غم سے ہیں تاب میں

کوئی سر پر اس غم سے ڈالے ہے خاک
کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

ہمیں داغ وہ [illegible] دے گیا
بہت آب یہ ماجرا لے گیا

سنا اس کی ہمسر نے جب یہ سخن
ہوا موج زن بحر رنج و محن

نگہ اک طرف در کے پائیں کی
دم سرد کھینچا گیا ڈوب جی

وہیں بے خودی رخصت جاں تھی
نہ تھا اک دم کی گویا کہ مہمان تھی

گری ہو کے بے جان وہ دردمند
ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

موئی غم میں اس جان تن ناز کے
گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اس کنے زود تر — جو تھا در پئے امتحاں بے خبر
کہ وہ رشکِ مہ امتحاں دے گئی — محبت کے ناموس کو لے گئی
ہوا سن پرسرام کے تئیں موئی — مرے اک سخن میں قیامت ہوئی
اگرچہ نہ کچھ ان نے منھ سے کہا — دیا جی وے جی اسی میں رہا
یہ سن کردہ نافہم حیراں ہوا — خجالت سے سرور گریباں ہوا
گیا ہوش سن کر یہ پرسرام کا — دوانہ ہوا عشق کے کام کا
اٹھا بے خود و بے خبر بے حواس — گرا آکے اس پیکر مردہ پاس
لگا کہنے اے مایۂ زندگی — مجھے منھ سے تیرے ہے شرمندگی
کیا جلد رحلت کو تو نے یار — نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار
نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی — مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی
زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے — لب آب جا کر جلایا اسے
جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی — محبت عجب داغ دکھلا گئی
یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا — لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا — رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
گئے ہوش و صبر اس کے ایک بارگی — طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے تگو دو ہر سدا — پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار — کف غم میں سر رشتۂ اختیار
کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے — کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے
کبھو یاں کبھو واں بحال خراب — وہی بے قراری وہی اضطراب
رہے گھر تو آشفتہ گہہ وہ گلی — چمن میں جو لے جائیں تو بے کلی
کبھو متصل ہونٹھ پر آہ سرد — کبھو دست بر دل کہ دل ہی میں درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لا دیں اسے
کبھو روتے دریا پہ پا دیں اسے ۔

کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا
ہوئی رات واں سے نہ آیا گیا

کنارے پہ رہتا تھا ایک دام دار
رہا رات اس کے یہ قرب و جوار

کہا اس کی صورت نے اس بات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں
تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں

تراش کو دریا میں پڑتا تھا دام
تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام

تو جاتا نہیں شب کو کئی روز سے
معیشت ہے اندوہ جاں سوز سے

نہیں طاقت صبر ہم کو تنک
بہت دیر ملتا ہے نان و نمک

وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں
بہت تنگ دستی سے حیران ہوں

کہوں کیا کئی روز سے شام کو
اٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو

کہ یک شعلۂ تند پر پیچ و تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیک آب

کوئی دم تو رہتا ہے سرگرم گشت
کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پرسرام تو ہے کہاں

یہ آتش مرے دل کی کیوں کر بجھے
عدم میں بھی میں نے نہ پایا تجھے

کیا عشق نے مجھ کو آتش کا باب
نہ چھڑکا مری آگ پر تو نے آب

گیا وہ یہ کہہ کر سوئے آسماں
رہے ہے مجھے رات دن خوف جاں

سنا حال شعلہ کا صیاد سے
دھواں ایک اٹھا جان ناشاد سے

ہوا شعلۂ شوق دل سے بلند
رہا لوٹتا آگ میں جوں سپند

گئی رات جوں توں ہوئی صبح جب
زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب

محبت نے کی اشتعالک کہ وہ — سراسیمہ آیا چلا اس جگہ
جہاں سے اٹھی تھی یہ آتش سلگ — پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ
تبسم کناں واں یہ ان نے کہا — کہ کلفت ہیں غم کی بہت میں رہا
چلو سیر گشتی کو ہنگام شب — لب آب خالی کریں دل کو سب
ہوا سو ہوا یوں ہی تقدیر تھی — جہاں سوز الفت کی تاثیر تھی
نہ ہوتے جو دل گیر یاں متصل — نہ ہوتی یہ آتش کبھو مشتعل
کہاں عقل کی ان نے باتیں جو واں — وہ عاشق جو تھا در پئے امتحاں
لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے — کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے
سو یہ دن خدا نے دکھایا مجھے — سخن تیرے منھ کا سنایا مجھے
ندامت سے ہوں تنگ شاید میں سب — گرفتار ہوں میں بحال عجب
نہ خجلت سے رو ہے جو کچھ میں کہوں — نہ قدرت اجل پر کہ مر بھی رہوں
نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب — نہ جانا کہ اتنی ہے وہ ناشکیب
ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب — خرابی کا تیری ہوا میں سبب
کروں گا زمانہ میں جب تک معاش — رہوں گا اسی درد سے دل خراش
مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ — کہ آئندہ رہیئے تری خاک رہ
جو اس میں ہے خوش تو بھی میں بھی ساتھ — رہیں گے لب آب ہی آج رات
دل پر کو خالی کریں گے بہم — پھریں گے ترے ساتھ خوش کوئی دم
ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں — نہ پیدا کسو پر یہ راز نہاں
کہ اک آگ سلگی ہے واں لب کنار — محبت سبھی میں ہے سرگرم کار
کسو اشتعالک کی ہے منتظر — جہاں سر کو کھینچا قیامت ہے پھر
ہوئے ناؤ پر شام گہہ جب سوار — کہاں ان نے یاں ایک ہے دام دار

جہاں قفل ہو راہ دریا تو واں — کفایت ہے اس گلبدن کی زباں
اسے سات لو تو بڑی بات ہے — کہ دریا میں بھرنا ہے اور رات ہے
لیا آخرالامر ہمرہ اسے — بٹھایا قریب اپنے یہ کہ اسے
تنک دور چل کر کیا یہ سوال — مجھے ہے ترے حرف سب کا خیال
کہاں شعلہ سرکش آتا ہے یاں — کدھر پیچ و تاب آکے کھاتا ہے یاں
کہاں لے ہے دریا یہ اک دم قرار — کدھر مضطرب ہو کرے ہے گذار
ٹھہرتا ہے کس جا وہ آتش فگن — طرف کون سے ہو کے گرم سخن
یہ صیاد سے تھا ہی محو سراغ — جگر آتش شوق رکھتی تھی داغ
کہ ہو کر فروغ اک سوئے آسماں — تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
کوئی دم میں دریا یہ آیا فرود — ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود
لب آب و شعلۂ جاں گداز — تڑپ کر بہت با زباں دراز
پکارا کہاں ہے پر سرام تو — محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
کہ ہیں جملہ تن آتش تیز ہوں — دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے — لب آب اترون ہوں غم میں ترے
مگر سوزش دل ہو کم آب سے — بچے دل میرا اس تب و تاب سے
سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا نام — کیا عشق نے آہ دشمن کا کام
یہ بیتاب سن کر ہوا بے قرار — سفینے سے اترا بصد اضطرار
ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے — کہا اس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرسرام خانہ خراب — میرا دل بھی اس آگ سے ہی کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے — یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برق خرمن ہوئی — تری دوستی جی کی دشمن ہوئی

سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا — کچھ اک ایسی جاگہہ سے یہ دل جلا
بہم گرم جوشی سے اک جا ہوئے — کہ گذری تھی مدت. تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل — کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
یکایک بھڑک کر وہ چلنے لگا — پھر ایدھر اُدھر پھرنے چلنے لگا
گیا پاس پانی کے آکر صعود — رہی روشنی سی کوئی دم نمود
خبردار ہو اہل کشتی تمام — لگے کہنے باہم نہیں پر سرام
پھر آگئے کسو پر نہ پیدا ہوا — نجانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
اٹھے ڈھونڈنے ہو کے سب ناصبور — کنارے پہ دریا کے نزدیک دور
نہ پایا کہیں اسکو حیراں ہوئے — نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے
وہ صیاد بولا کہ دونوں میں نشاں — گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں
یہ اور آگ دونوں ہوئے ہم سخن — وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن.
یہ جوشش تو یاں سے تھی مد نظر — پھر آگے نہیں اُس کی مجھ کو خبر
نہ ہو آتشِ غم سے پہلے ہی داغ — چلو اس طرف کو جو نکلے سراغ
گئے مضطرب حال سارے رواں — تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں
تلاش اس کی کی اور لیے کے نام — پکارے بہت پر کہاں پر سرام
محبت نے ایسا کھپایا اسے — کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اُسے
یقین ہوا یہ کہ وہ تیز گام — اسی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ!
لپٹ اُس کو شعلہ ہی دے گیا — عجب طور کا داغ یہ دے گیا
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب — کسی کو تحیر کسی کو عجب
کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا — کوئی بر لب آب جانے سے تھا
خصوصاً وہ عاشق ہوا پر خجل. — ندامت ہوئی یہ جیسے متصل

نہ تھا اگلی عجلت ہی سے رفت حرف ۔۔۔ ہوا دوسرا ماجرائے شگرف
تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا ۔۔۔ کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا
کرو پوچھیں گے جو اس کے واماندگاں ۔۔۔ تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیاں
کہوں کیوں کہ یکبار وہ جل گیا ۔۔۔ کف خاک ہو خاک میں مل گیا
کھنچی جرم کو بے گناہی مری ۔۔۔ ہوئی شہر میں رو سیاہی مری
وہ شعلہ جلاتا مجھے کاش کے ۔۔۔ لئے ساتھ جاتا مجھے کاش کے

مقولۂ شاعر

اگرچہ یہ قصہ بھی حیرت فزا ۔۔۔ ولے تیر یہ عشق ہے بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے ۔۔۔ بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر ۔۔۔ جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ۔۔۔ ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا ۔۔۔ کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں رونا ہوا ندامت کا ۔۔۔ کہیں ہنسنا ہوا صراحت کا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا ۔۔۔ کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
گہہ نمک اس کو داغ کا پایا ۔۔۔ گہہ پتنگا چراغ کا پایا
واں تپیدن ہوا جگر کے بیچ ۔۔۔ یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے ۔۔۔ کہیں یہ خوں چکاں شکایت ہے

تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نم ناکی — ہے کسو خاطروں کی نم ناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ جان آگہ کا — سوزش سینہ ایک جاگہہ کا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا — کہیں اندوہ جانگداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بے تابی — تھی کسو مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بیستوں میں شرار تیشہ رہا
کسی تے زلیت کو لگائی آگ — کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ
کبھو افغان مرغ گلشن تھا — کبھو قمری کا طوق گردن تھا
کسو مسلخ کا جافتارہ ہوا — کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی — ایک محفل میں جا پسندی کی
ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود — ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک زمانہ میں دل کی خواہش تھی — اک سمیں میں جگر کی کاہش تھی
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خارِ دل غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہل ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جاں پر غم کا
آرزو تھی امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی
نمکِ زخم سینہ ریشاں ہے — نگہِ یاس مہر کیشاں ہے
حسرت آلودہ آہ تھی یہ کہیں — شوق کی یک نگاہ تھی یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا

کون محروم وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے
ہاں یہ میر رنگ ساز پکا ہے
جس کو ہو اس کی التفات نصیب
ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصہ جانگداز

ایک جا ایک جوان رعنا تھا
لالہ رخسار سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے
انس رکھتا وضع دل کش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورت حال اور ہو جاتی
دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتے اس کے حال کو درہم
دیکھتا گر وہ کوئی چشم سیاہ
دل سے بے اختیار کہتا آہ
سر بسر تھا شور شوق دل میں تھا
عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوان خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اک خیابان میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے وہ نکلا
نہ تسلی ہوا دل بے تاب
نہ تھا چشم تر سے خون ناب

دل کی واشد سے بے توقع ہو — ہر شجر کے تلے بہت سا لہو
دیکھ گلشن کو نا امیدانہ — منہ کیا ان نے جانب خانہ
دل کے رکنے کا اس کو اک غم تھا — راہ چلنے میں خیال درہم تھا
ناگہہ اس کوچہ سے گذار ہوا — آفت تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اس کی۔
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداغ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج آدائی کی — تاب و طاقت نے بے وفائی کی
منہ جو اس کی طرف سے اُس کا پھرا — مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا — بے طرح ہووے گو کہ حال اُسکا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ
وہ گئی اس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا تپیدن ناز — رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک؟
طبع نے اک جنوں کیا پیدا — اشک نے رنگ خوں کیا پیدا۔
سوزش دل نے جی میں جاگہ کی — داغ نے آ جگر کو آتش دی
بستر خاک پر گرا وہ زار — درد کا گھر ہوا دل بیمار۔
خاطر افگار خار خار ہوئی — جاں تمنا کشِ نگار ہوئی
اُس کے منہ پڑی جو اس کی نگاہ — نا امیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ — رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹ سوکھے تو خون ناب ملا — خواب و خور دونوں کو جواب ملا
خلق اس کی ہوئی تماشائی — پر نہ دیکھنے کبھو آئی۔
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے — رو دیا اُن نے ایک حسرت سے
جا کے اس کے قریب در بیٹھا — قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا!
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا — شوق نے کام کو خراب کیا
جو نہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ — رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اس کو کسو کا جان گئے — سب تبرا اس ادا کو مان گئے
کیوں کہ باہم معاش تھی سب کی — ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے — در پئے دشمنیٔ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں — دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام — سن کے آخر کہیں کے خاص و عام
کیا گناہ تھا کہ یہ جواں مارا — کن نے مارا اسے کہاں مارا
ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار — کھینچنی ہو وئے خفتِ بسیار
کیجئے ایک ڈھب سے اس کو تنگ — تا نہ آید ہو اپنی جانب ننگ
تہمت خبط رکھیے اس کے سر — کیجئے سنگ سار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار — ہو گئے سارے در پئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا — ایک نے آ کے زیر سنگ کیا۔
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر — ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
کی اشارت کہ کودکانِ شہر — آئے لبریز غصہ و پر قہر
گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا — ایک روئے دل اس کا اودھر تھا
محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ — تھا گرفتہ اپنے حال کے بیچ

پہونچے پر حسن کا بیان اُس کا — تھا سرِ سنگ آستاں اُس کا

ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھتا — نالہ گرم گاہ گاہ کرتا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے — اس طرف یک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ — دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

چشمِ تر سے لہو بہا کرتا — صبح کے باد سے کہا کرتا

کہ اے نسیمِ سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیئے — جان پر آ بنی ہے تیرے لیے؟

جان دوں تیرے واسطے سو تو — آنکھ اُٹھا ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا وہ سودائی — دور پہونچی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترسے نہ جانا آہ — تجھ سے کیوں کر سخن کی نکلے راہ

نا امیدانہ گر کروں ہوں نگاہ — دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق — بے کسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گہہ گہے دلجو — گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل — جی ہے اس سے اسیرِ آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی — صورت اک معنیٔ نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — اس کو ہیں اور کتنے تصدیقات

سنگ باراں سے سخت ہوں دل تنگ — شیشۂ دل یوں ہی ہے پارۂ سنگ

محرمِ یک نگاہ بیش نہیں — کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں

کیوں کہیے کہ تو نہیں آگاہ — ایک قیامت بپا ہے یاں سرِ راہ!

کچھ چھپا تو رہا نہیں یہ راز — اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز
بس تغافل ہوا ترحم کر — گوشش دل جانب تظلم کر
کون کہتا ہے رہ نہ محو ناز — پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز
اُن بلاؤں پہ ان نے صبر کیا — اختیار اپنے جی پہ جبر کیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا — اس کے اندوہ سے نہ منھ موڑا
اور یہ ماجرا ہوا مشہور — شور رسوائیوں کا پہونچا دور
دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب — جانا ہر اک نے عاشق بے تاب
منھ پہ اس کے جو رنگِ خون نہیں — عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں
ہے نگہ اس کی جس طرف مائل — اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
جب ہوا ذکر اقل واکثر میں — چاہ ثابت ہوئی اسے گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا — مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہر دفع رسوائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرت مہ تاباں — جا کے چندے رہے کہیں پنہاں
شب محافے میں کر کے اس کو سوار — ساتھ دے ایک دایۂ غدار
پار دریا کے جلد رخصت کی — اس طرح فکرِ دفع تہمت کی
گھر تھا اک آشنا کا مدّ نگاہ — واں ہو روپوش تا یہ غیرت ماہ
ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع — تو ضیا فزا سے خانہ ہو جوں شمع
گھر سے باہر محافہ جو نکلا — اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
تپش دل سے ہو کے یہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
واں کے رہنے سے اس کو کام نہ تھا — وہ گئی اس کا کچھ مقام نہ تھا
جس سے جی کو کمال ہو الفت — جس سے دل کی درست ہو نسبت

جنبش اس کی پلک کو گرداں ہو — دل میں یاں کاوشِ نمایاں ہو

واں اگر مو شکست کا ہو باب — یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب

واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار — دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار

یار کو درد چشم اگر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے

چاک دامن میں واں پے زینت — یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت

واں نہ ہو تنگ یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یک رنگی

دست افشاں وہ پائے کوباں یہ — تھا محافے کے ساتھ گرم رہ

قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام — در پہ یار تھا یہ بے آرام

ہر قدم تھا زباں پر جاری — خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اس کی تھی میسر کب — ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

شوق مفرط نے بے تہی کی سخت — ناشکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے — اڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطراب دل نے زور کیا — دل نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زباں پہ لایا — آفت تازہ جان پر لایا

کائے جفا پیشہ و تغافل کیش — اک نظر سے زیادہ نہیں کچھ بیش

منہ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی — نگہِ التفات ادھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گذرتا — چارہ اس بن نہیں کہ سر گذرتا

منزلِ وصل دور میں کم پا — تجھ کو اس مرتبہ میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز — ایک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی — آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی — جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ — دل مرا مبتلا ہے داغ سیاہ
تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال — میں ستم کش ہوا کیا پامال
بستر خواب پر تجھے آرام — مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام
واں لب لعل تیرے خنداں تھے — یاں فسردہ جگر پہ دنداں تھے
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے — رحم سے آشنا کیا نہ تجھے
اب تغافل نہ کر تلطف کر — حال پر میرے ٹک تأسف کر
گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن — تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلی کی — وعدۂ وصل سے تشفی کی
کاے ستم دیدۂ غم دوری — ہو چکا اب زمان مہجوری
زار نالی نہ کر شکیبا ہو — عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے — چل کوئی دم کو داد خواہش دے
سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ — قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے — اس کی بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے کہنے سے دل کشادہ ہوا — نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزم عشرت کریں گے باہم ساز — ہو جواب اپنے دوست کا دم ساز
دے کر اس کو فریب ساتھ لیا — دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ اس نے یہ ٹھانی — کیجئے اس سے خصمیٔ جانی
یہ تو دل تفتۂ محبت تھا — سخت وارفتۂ محبت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہونچا — تا سر آب پا بپا پہونچا
آب کیسا کہ بحر تھا زخار — تند و موّاج و تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر — مارے چشمک حباب عمّاں پر

ہمکنارِ بلا ہر اک گرداب — لجۂ سرمایہ بخش تیرہ سحاب
گذرِ موج جب نہ تب دیکھا — ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود — ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ — تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینے میں جلد جا پہونچا — یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر — کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اک بار — اور بولی کہ اے جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش — موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرت عشق ہے تو لا اس کو — چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو
اس طرف آب کے اترنا ہے — اس نواحی کی سیر کرنا ہے
پانوں اس کے ہیں نگار آلود — ظلم ہے ہووے گر غبار آلود
جس کفِ پا کو رنگِ گل ہو بار — منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار
ان پہ نرمی میں گل سے بیش جو ہیں — آبلہ چشم کو سیاہ کرے
یہ روا ہے تو اپنے حساں پہ رو — مفت ناموس عشق کو مت کھو
جی اگر تھا عزیز اے ناکام — کیوں عبث عشق کو کیا بدنام
سن کے یہ حرف دایۂ مکار — دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر کار عشق کی تہہ سے — جست کی اس نے اپنی جاگہ سے
تھا سمجھنے میں یا کہ دریا میں — موج زنجیر ہو گئی پا میں
کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب — تھی دریائے عشق کی کشمکش تہ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں — لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں۔
ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے — غرقِ دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اُس کو
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں
کھو گیا گوہرِ گرامی جہاں

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
واں سے کشتی چلی برنگ باد

خار خارِ دلی سے فارغ ہو
لے گئی پار اُس گلِ نو کو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسر اگر
لا دے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاک خوباں بھی ان نے دی برباد

قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرومایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزو مند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
ساتھ اس کے گئے وے شور و فساد

شور و فتنے تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے
حال جی کا مرے دگرگوں ہے

بے دماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کے وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہو دیگا
آج کل میں جنون ہو وے گا

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے
طاقت دل جواب دیتی ہے

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر
ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو
ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز　　حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز
اب تو میں فتنے کو سلایا ہے　　اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے
کلیتاً مانع ہے گھر کے چلنے کا　　سدِ رہ کون ہے نکلنے کا
ہو محافے میں دل خوشی سے سوار　　شاد شاداں کر آب سے تو گذار
دل سے اپنے پدر کے غم کم کر　　مادر مہرباں کو خرم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو　　گرم بازی ہو محرموں سے تو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق　　گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے　　عاقبت اس کو مار رکھتا ہے
جذب سے اپنے جب کرے ہے کام　　عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید　　اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہونچی نصف النہار دریا پر　　روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی　　دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ　　یاں گڑا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش　　تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
تجھکو آیا نظر کہاں آ کر　　پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھکو نہ تجھکو نشان اس جا کا　　میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب　　نا شناسائے موجہ و گرداب
لجہ کیا نغمہ کس کو کہتے ہیں　　گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور　　اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل　　لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق　　ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف　　یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند　　پھر نہ تھا کچھ بسراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر　　گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ　　لپٹی اس کو بہ رنگ مار سیاہ
دام گستردہ عشق تھا تہ آب　　جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آدے　　نور مہتاب جیسے لہرا دے
تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں　　غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم کے آب ہو کے بہا　　سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کشش عشق آخر اس مہ کو　　لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
کودے غواص و آشنا سارے　　تا بہ مقدور دست و پا مارے
جا ہم آغوش مردہ یار ہوئی　　تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آلائش　　ہو گئے دست و بغل کی آسائش
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بے تاب　　نہ لگا ہاتھ وہ در نایاب
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ　　آفت اک لے گئی نئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب　　خاک افشاں بسر و نالہ بلب
دار و دستہ تمام اس گل کا　　ترک آئین کر تحمل کا
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں　　آتش غم سے دل جگر بریاں
خلق یک جا ہوئی کنارے پر　　حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا　　آخر ان کو اسیر دام کیا
نکلے باہم وے موئے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا　　مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں　　ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے

کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی دار | ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے ان کا وصل | جان دیدے ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم | شکل تصویر آپ میں تھے گم
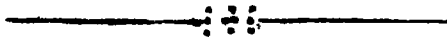
مقولۂ شاعر

میر اب شاعری کو کر موقوف | عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے | اس سے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے | کتنی طاقت تری زباں میں ہے

لب پہ اب مہر خامشی بہتر
یاں سخن کی فرامشی بہتر

مثنوی عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام دار
الٰہی زباں دے مجھے مغز دار

صفت عشق کی تا کروں میں بیاں
رہوں عشق کہنے سے میں نغز زباں

عجب عشق ہے مرد کار آمدہ
جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ

جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا
صف اُلٹی جہاں ایک مارا پڑا

اگر لوگ مارے گئے سربسر
ولے فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر

کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا
تہہ تیغ اس کے تلف ہو گیا

جہاں جس کسو سے اِسے چاہ ہے
وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے

کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی
درونے میں اس کی لگی آگ سی

ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں
تو نام ونشاں اس کا پھر واں نہیں

وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق
پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق

جواں کیسے کیسے موئے عشق میں
بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے
بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے

گئے دشت میں کچھ نمد مو ہوئے
کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے

نہ مرغِ چمن ہی ہے نالان و زار
گئے داغ کہسار سے لالہ زار

کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا
کسو کوہِ کن کو جنوں ہو گیا

کوئی زار باراں بہت رو چکا
کوئی برق ساحل بجھا ہو چکا

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے — نئی روز شہروں میں اک گور ہے
بہت جان ناکام دیتے گئے — تمنائے دل ساتھ لیتے گئے
بہت اہل اسلام کافر ہوئے — بہت اول عشق آخر ہوئے
بہت جرم الفت پہ مارے گئے — جُوا عشق بازی کا ہارے گئے
ہوئے خاندان کیسے کیسے خراب — جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب
کیا عشق جس دن سے مرتے رہے — جیون ہی کا اندیشہ کرتے رہے
کسے عشق نے جی سے مارا نہیں — یہی درد ہے درد چارہ نہیں
دوا عشق کی سخت نایاب ہے — سر عاشقاں سنگ کا باب ہے
جو ہو عشق عارض تو پھر یاس ہو — عبث کوئی دن جینے کا پاس ہے
محبت ہے نیرنگ ساز عجیب — فسانے ہیں اس کے عجیب و غریب
کوئی عشق کرنا دھرا تھا وہے — گئے میکدے سے بھی صوفی پرے
نہ واں مکر و نے شید و طامات ہے — خرابات جانا کرامات ہے
کہیں عشق نے آرزو کش کیے — گئے خوش جو عاشق سو ناخوش گئے
کہیں سہل تر یار مرنے لگے — کہیں لوگ دشوار مرنے لگے
کہیں کام ان نے کیے ہیں عجب — فسانہ ہوئی بزم عیش و طرب
کہیں بادشاہ اس سے درویش ہیں — کہیں اس سے درویش دلریش ہیں
لیا کاہ کا کوہ سے کیں کہیں — ملائے کہیں آسمان و زمیں
کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد — رہے زیر شمشیر حد سے زیاد
یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے — مراد خطر کہہ ہے اس شہر سے
ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب — رہے دل شکستہ پریشاں خراب
اٹھا عشق کا شور عزلت گزیں — گئے دشت گردی کو کر ترک دیں

ہوا عشق سے مجلس حال دہر — تواجد لگے کرنے شیخانِ شہر
کیا عشق میں ترک صوم و صلوٰت — گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن — گئے کعبہ کو چھوڑ دین کہن
نہ سبحہ نہ زنّار نہ کفر و دیں — جہاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
محبت کے ساغر کش اہلِ صلاح — یہ بے ہوش دارو ہے ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں — ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں
رباطی ہیں خانہ سیہ عشق میں — مصلے ہوئے ان کے تہ عشق میں
ہمہ خاندان تعنادت خراب — خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہے کام — یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے نام
اسی عشق سے رد سیاہ رو سفید — رکھیں عشق سے نا امیدان امید
یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ — یہی عشق حلال مشکل ہے یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف — کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ دے درد دیں — کہیں کافرانہ ہوا بے یقیں
غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز — کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں — کہ افغاں پسر ایک گجرات میں
جواں خوش تھا پر کار و پرہیزگار — بہت حسن کا اس کے واں اشتہار
یہ صورت یہ طاعت یہ دامانِ پاک — نہ دامن پہ مانند گل گرد خاک
اگر ہووے حور بہشتی دو چار — وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈے کنار
دگر آگے سے ہو پری کا گذر — حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر

رہے محو پاکیزگی و صلوٰۃ ‏ ‏ نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات
تناسب بہت اس کے اعضائے خوب ‏ ‏ سراپا میں دیکھو تو ہر جا ہے خوب
زباں نرم طالع وری و صلاح ‏ ‏ نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو ‏ ‏ کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف ‏ ‏ لب شرح یہ دل بروں کا نہ حرف
حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ ‏ ‏ نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ
بہت پاک دامن معیشت ہوئی ‏ ‏ نظافت نزاہت میں مدت ہوئی
کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی ‏ ‏ جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی
جواں کی نظر شرمگیں جا لڑی ‏ ‏ وہ شرمانی آنکھ اس کے اوپر پڑی
نہ دل مستقل ناشکیبا ہوا ‏ ‏ دل طرف ثانی بھی بے جا ہوا
حیا دار تھی زن گئی اپنے گھر ‏ ‏ وفادار تھا یہ رہا دیکھ ادھر
کیا چند شرط وفا ہی کا پاس ‏ ‏ لگے رہنے دونوں گھروں میں اداس
کئی دن ہندو زن آنے لگی ‏ ‏ لیے پانی اس راہ جانے لگی
نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا ‏ ‏ محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی ‏ ‏ دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی
جیوں میں شب و روز مرتے رہے ‏ ‏ ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے
رہے دیر تک دونوں ناکام عشق ‏ ‏ نہ آیا لبوں پر کبھو نام عشق
یہ کیا دخل اظہار الفت کریں ‏ ‏ یہی بستہ لب مشق حیرت کریں
گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری ‏ ‏ درو بام پر پڑتیں حسرت بھری
لبوں پہ نہ آیا کبھو حرفِ عشق ‏ ‏ اگرچہ ہمہ تن رہے صرفِ عشق
بجایا کئے پردے میں سازِ دل ‏ ‏ نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل

دِوانوں میں تو گرم جوشی رہی   دہانوں پہ مُہرِ خموشی رہی
کریں حسرت آگیں نگہ چار اور   لب ان کے ساکت سر دنیں یہ شور
کھوے نہ حرف و حکایت اُنھیں   محبت سے شکر و شکایت اُنھیں
کہیں درد دل سو کبھو زیر لب   دگر نہ سکوں ان کو نھا جب نہ تب
شب و روز دونوں تھے صورت مثال   بہم محوِ خوبی و صرفِ خیال
پئے جائیں آنکھیں بھری بہر ضبط   کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط
کبھو آہ اٹھتی تو دم سرد ہو   کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو
دلوں میں جو تھی چاہ تو خوں ہوگئے   گرفتہ رہے سو جنوں ہو گئے
بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت   کہ تا شہر میں کام مشکل بہت
ارادے ہوئے یہ دلوں میں ہی خلت   کیا پھر بھی دونوں نے صبر و سکون
صبا سے رہے دو طرف کے پیام   کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام
خیالات ملنے کے جاتے نہیں   قرار و سکوں دل تک آتے نہیں
شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب   کیا شوق نے کام کو کیا خراب
کوئی طور ملنے کا ایجاد کر   نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر
پیام ایک کا کہ اے باد نرم   کہو اس کو محبت سے کچھ بھی ہے شرم
تنِ زار بے جان کیونکر جیئے   جگر میں نہ ہو خون تو کیا خاک پیئے
ملاقات کا رکھے کیونکر خیال   رہے کیوں کہ جاں نا امیدِ وصال
اگر دیکھیں آنکھیں ہیں دو اس طرف   دگر منھ ہمارا ہے سو اس طرف
اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی   ادھر بھی چلی جائے ہے جان بھی
کہو اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لئے   کیا عشق یا جرم ہم نے کیئے
نہیں صبر آتا ترے بن ملے   لبوں سے جگر تک بھرے ہیں گلے

کسو سے کسو کو نہ ہو جائے لاگ
کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ

کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن
کہ جانِ المناک دیجے ندان

کسو کے سبھو نہ کھل جائیں حال
کہ ہو دل کے عقدوں کی واشد محال

کسو لالہ رخ کا نہ اٹھے نقاب
کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب

قد آرا نہ ہو فتنہ در سر کوئی
کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی

کسو کے نہ چاہِ زنخ میں گریں
مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں

کسو کے نہ انداز پر جائے جا
صبا ہوئے کیا جانیے کیا سے کیا

کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں
کہ لوگ اس کا آخر یہ دیکھا کریں

کسو کے نہ ایمائے ابرو پہ جائیں
فریب عزیزاں ہندگاں تا نہ کھائیں

صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو
کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو

دلِ زار تجھ بن ہے بے کل بہت
نہ جی کو مرے بن ملے مل بہت

گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں
یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں

انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں
کوئی ان کو ڈھونڈے تو پھر یہ کہاں

کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار
ہمارا ترا عشق ہے یادگار

ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں
تلطف کہ ہم میں رہا کچھ نہیں

نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے
گلِ تر یہ چند اوس باقی رہے

گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں
تلف جیسے ہر دم ہو آبِ رواں

نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں
اٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں

نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش
کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش

نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی
کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی

نہ پڑتی مری آنکھ گر اس کی اور
تو اٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور

ہوئی آتشِ عشق آخر بلند — جگر دل ہوئے دونوں اس کے پسند
زمانے تھے اس آگ کے کیا دراز — ہوئی دونوں بیتابوں کی جاں گداز
پڑی آگ وہ دل جگر جل گئے — جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے
ہوا ناگہاں شوہر زن مریض — نہایت ہوئی تب طویل و عریض
تشنت ہوا تپ کا دل کے تئیں — گئی رفتہ رفتہ دق و سل کے تئیں
نزاری سے دل ہو گیا زار تر — ہوا خشک ہو کر وہ بیمار تر
بدن کاہ سا زرد رنگ کا ہی ہوا — بہت حال اس کا تباہی ہوا
دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا — ٹھہر کر گئے دم ہوا ہو گیا
فنا یعنی طاری ہوئی ہو چکا — اسے دار و دستہ بہت رو چکا
جلانے کی تیاری کرنے چلے — چلی زن بھی تا ساتھ اس کے جلے
کھلی دعویٰ سوختن میں زبان — کیا پاس ظاہر سے نقصان جان
لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو — خبر پہونچی اس زرگر زار کو
اٹھا واں سے بیتاب آیا چلا — اسے دیکھ جلتے بہت جی جلا
جھکا آگ کی اور کر اضطراب — کہ جی میں نہ طاقت تھی مطلق نہ تاب
کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی — نظر اس کی جلتے جو اس پر پڑی
کہا آتے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو بہم پاؤ تم
یہ بے تاب تھا آگ پر پھر پڑا — پتنگا سا اس شعلے پر گر پڑا
لگے آتے جتنے کنے انفار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
چلے ادھر جلا سے کے سب اس کو گھر — ہوا گرم ہنگامہ اک یہ ادھر
کیا اس کے لوگوں نے سر پر ہجوم — ہوئی شہر میں شور محشر کی دھوم
قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں — ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں

تعب کش ہوں میں آتش تیز کا
اُسے قصد تھا میرے خونریز کا

لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال
کیا گھر بھی چلنے کا اب خیال

نہیں مستقل راہ چلنے کی تاب
کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

کہیں مجکو سائے میں ٹھہرایئے
جو دم ٹھہرے تو آگے لے جایئے

کوئی دم میرا کھینچیئے انتظار
کہ گرمی سے ہوں بے خود و بیقرار

توقف کیا سب نے زیر درخت
کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ جانا کہ ہے مانع راہِ عشق
رکھے ہے عجب جذب جانکاہِ عشق

نہ آتش نہ گرمی نہ بیطاقتی
بہانے ہیں سب جذب ہے الفتی کا

عجب ترنظر آتے ہیں کارِ عشق
نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرارِ عشق

اٹھانے کو کہنے تو کہلائیے تھا
دل اس ادھر ہی چلا جائے تھا

اگر آنکھیں کھلتیں تو ادھر نظر
ہوئی خاک معشوقہ جل کر ادھر

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام
نظر کرکے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں جہاں آتی ہے وہ پری
وہی ناز عشوہ وہی دل بری

وہی صورت اس کی ہے جلوہ نما
وہی رنگ رو گل کا غیرت فزا

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اٹھایا اسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

گئے اس طرف لے جدھر تھی چلی
نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

وے مانعیت کا کس کو جگر
کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں
گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

بہت سے ہوئے لوگ گرم سراغ
کنھوں نے نہ پایا نشاں غیر داغ

نہ کر میر اب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھ دے بھی تو

فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار — یہی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار
بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے — رہ عشق میں جی بہت کھو گئے
غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک
کیے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

مثنوی معاملات عشق

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا — ان نے پیغام عشق پہنچایا
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمدؐ کہیں علیؑ ہے کہیں
عشق عالیجناب رکھتا ہے — جبرئیلؑ و کتاب رکھتا ہے
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے — عشق ہی مظہر عجائب ہے
عشق کیا کیا مصیبتیں لایا — روز کو رات کر کے دکھلایا
عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں — عشق سے رنگ سبز پاتے ہیں
عشق سرتا قدم امید ہوا — زیر تیغ ستم شہید ہوا
مجھ سے مت پوچھ یہ کہیں ہے عشق — عشق ہے ان ہی کو جنھیں ہے عشق
عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے — عشق سے دل میں درد ہوتا ہے
رہتے ہیں عشق میں مژگان تر — یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر

عشق ہی کا خراب ہے کنعاں — عشق ہے ایک خانہ آباداں
عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا — اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا
قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا — سر پہ فرہاد کے سنا جو ہوا
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں — آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے — ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے
ایکوں کا جیب تا بدامن چاک — ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک
شان ارفع ہے جن کی خوار ہیں یاں — عقل والے جنوں شعار ہیں یاں
خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے — بادشہ عشق میں فقیر ہوئے
کوئی دل تنگ ہو کنوئیں میں گرا — کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا
جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ — تب دیا جی کو ان نے پیش چراغ
عشق کی فاختہ ستم کش ہے — عشق سے عندلیب دم کش ہے
عشق باعث ہوا وطن چھوٹے — مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے
مایۂ درد و رنج سب ہے عشق — متصل رونے کا سبب ہے عشق
پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید — کچھ نہ پایا کسھوں نے عشق کا بھید
اپنی تیغِ ستم جو اینچے عشق — جامے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق
عشق سے قمری ہے حریف سرو — مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرو
عشق کے دل فگار سارے ہیں — ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں حق ناحق ان نے خون کئے — کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لئے
کوئی محوِ گذاف ہیں اس سے — کہیں میدان صاف ہیں اس سے
اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ — ایک فرقہ کا ہے یہ جی کا روگ
ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے — ایک کا دن سیاہ ہے اس سے

ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی ایک کو بیدمی ہے جیسے غشی
ایک ناشاد زندگانی سے ایکوں کے دل گداز پانی سے
ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں ایک کی جان ہی کے لالے ہیں
ایک نے کوہ اس سے توڑ دیئے ایک تھکاکر ان نے چھوڑ دیئے
چپ لگی ہے کسو کو اس کے سبب بند رہتے نہیں کسو کے لب
کوئی باتیں کرے ہے شوق کیساتھ کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ
ہے تواجار کسو کو حال کہیں کہیں نقصان ہے کمال کہیں
ایک محو لباس عریانی ایک سرگرم دامن افشانی
کسو کو فکر کوئی ذاکر ہے کوئی صابر ہے کوئی شاکر ہے
کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات عشق کے ہینگے مختلف حالات
سیر قابل ہیں اس کے دیوانے سننے کے گو ہیں ان کے افسانے
وصل میں جن کے دل رہیں بیجا فصل ہو تو انھوں کا حال ہو کیا
اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا کس پہ گذرا ہے یہ ستم یہ غضب

معاملۂ اوّل

ایک صاحب سے جی لگا میرا ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت نام سے ان کے تھی مجھے الفت
خوبی ان کی جو سب کہا کرتے گوش میرے ادھر رہا کرتے
بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے اس طرح مجھ سے وے دوچار ہوئے
کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ دل جگر سے گذر گئی وہ نگاہ!

بچکے منھ ان کا دیکھ رہتا میں — جی میں کیا کیا یہ کچھ نہ کہتا میں
وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے — پر تصرف میں ایک اور کے تھے
کرتے ظاہر میں احتیاط بہت — مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت
بات کی طرز میری ہی بھاتی — میری آزردگی نہ خوش آتی
پیار چتون سے پھر نکلنے لگا — دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں — بے دماغ اور بے گمان رہیں
کچھ کچھ آزار مجکو دینے لگے — قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم — کہنے لگتے کہ کیا گدا کی قسم
ایک دو دن میں بعد رفع ملال — لطف سے پوچھتے کہو کچھ حال
جو گذرتی تھی مجھ پہ میں کہتا — یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا

دیکھ کر روتے آپ بھی روتے
دل دہی کرتے جب تلک سوتے

معاملۂ دوم

ایک مدت تلک یہ صحبت تھی — کبھو الفت کبھو یہ کلفت تھی
رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا — ہاتھ پانوں کو اپنے لگوایا
گاہ بے گاہ پانوں پھیلاتے — میری آنکھوں سے تلوے ملواتے
چل کر آتے تھے جب کبھو ایدھر — پانوں رکھتے تھے میری آنکھوں پر
دیکھنے میں تو پائے مالی تھی — حسن سے چال یہ نہ خالی تھی
جلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل — کہ تنک اے سرو ہو ادھر مائل

کفِ پا رکھئے یاں تو احساں ہے
تیرے پانوں تلے مری جاں ہے

بلبل کے سینے پہ پانوں رکھ دیتے
دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے

کیا کہوں کیسا قد بالا ہے
قالب آرزو میں ڈھالا ہے

ایک جا گہہ سے ایک جا گہہ خوب
پیکرِ نازک اُس کے سب محبوب

موے سر اپنے جی بھی کرے نیاز
بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز

اس کے کاکل سے حرف سرنہ کرو
کاکل صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تم کو سودا ہے
کالے کوسوں کی بات کا کیا ہے

اس کی زلفوں سے دل گئے نہ بچھڑے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اس جبیں سے ہے دل کا کب جاذب
صبح صادق کے دعوے ہیں کاذب

ویسی بھویں کشیدہ بھی ہیں کہیں
یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھرتی پلکوں کی اور سب کی نگاہ
چشم پر میری تیری چشم سیاہ

کہوں چتون کے دیکھنے کے طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطح رخسار آئینہ سے صاف
جو نہ ٹھہرے نگاہ تو رکھئے معاف

لطف بینی کا فہم ہے دشوار
ایک باریک بینی ہے درکار

کیا جھمکتا ہے ہائے رنگ قبول
جیسے مکھڑا گلاب کا سا پھول

ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ
کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

اس سے گل کیا چٹنے کو ٹک ہمدم
غنچۂ ناشگفتہ سے بھی کم

برگ گل سے زباں ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو

دم بدم سوئے گوش اشارۂ صبح
گو ہر گوش یا ستارۂ صبح

جب بناگوش ان نے دکھلایا
صبح کا سا سماں نظر آیا۔

ان لبوں کا مزہ ایا سو بہانت — نسکے اد پہ ہمارا بھی ہے دانت

تم نہ گل برگ و لعل ناب کہو۔ — بات جب تک نہ ٹھہرے چپکے رہو

کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے — ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے

کنج لب آرزدے جان و دل — آگے چلنا نگاہ کو مشکل۔

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے — قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

جو حلاوت انھوں نے کی کہئے اب — ہمہ گر سے جدا نہ ہو دیں لب

جب وہ کھاتے ہیں بیڑہ پان کو — رو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو

ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ لبی — رنگ گویا ٹپک پڑے گا دبھی

ہو تبسم سے لعل کا دل خوں — ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں

نہیں دیکھے مسّی ملے دنداں — برق ابر سیاہ ہے تب خنداں

کیسے کیسے چمکتی ہے بے تہ — جگ ہلنسا ہے کرے ہے اپنی یہ

بو اگر کیجئے اس زنخ کا سیب — جائے سر سے جنوں کا آسیب

رہے گردن پہ ان کی میرا ہاتھ — یہ تو یارب ہے میرے جی کیساتھ

بس چلے تو گلے لگا ہی رہوں — تیغ سے پھر جدا کریں تو نہ ہوں

اس میں ہرچند جی کا نقصاں ہے — مدّعا اختلاط چسپاں ہے!

خوش و پہ کار کب پری ان سی — اور ہو تو کہاں ہے ہم جنسی

دیکھے از بس برآمدہ سینے۔ — ایسا معلوم دل جو یوں چھینے

کیا نظرگاہ کی کروں خوبی — نظر میں انقتی نہیں یہ محبوبی

شانہ و دست و ساعد و بازو — دل کشی میں تمام یک پہلو

اس کے تو پہلو سے میں ہو کے جدا — درد پہلو سے تنگ دل ہی رہا

ہائے اس سے خدا جدا نہ کرے — دور اس سے جیوں خدا نہ کرے

یوں نہیں سُرخ اس کی ہر انگشت　　ڈوبی ہیں میرے خون میں یکمشت
وہ کفِ دست راحت جاں ہے　　کاش سینے پہ رکھ دے غم یاں ہے
کیا بیاں خوبی شکم کو کرے　　دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے
صدر کے ناصیے سے نے تا ناف　　چپ کی جاگہ ہے کیونکہ کہیے صاف
اس سے پھر آگے غنچۂ گل ہے　　یاں سخن بابت تامل ہے
پردے میں بھی جو کچھ کہا جاوے　　آپ سے تو نہ ٹک رہا جاوے
اُنکی نظروں سے وہ کمر باریک　　ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک
اور کیا دل زدے کو بات آوے　　کہیں یارب شتاب ہاتھ آوے
نازکی اس میاں کی کیا کہیے　　بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیے
ٹک اگر لچکے تو قیامت ہے　　پھر قیامت تک ندامت ہے
کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق　　اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق
پائے جاناں سے گفتگو ہے اب　　خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب
وہ قدم کاش فرق سر پر ہو　　ساق سیمیں مری کمر پر ہوا
وہ کفِ پا قریب ہو میرے　　ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے
پنڈلی نازک ہے شاخ سنبل کی　　پشت پا پنکھڑی سی ہے گل کی
یوں نصیبوں سے ہو حنا کا نا نوُر　　ورنہ ڈوبے ہیں میرے خوں سے پانوُ
ہو خراماں تو اس طرف نگہیں　　گل کفش اس کی لوگ دیکھ رہیں
گل و بلبل سبھی تماشائی　　آگئے جس طرف بہار آئی
رنگ رفتار دیکھ مجنوں ہو　　طرز گفتار جیسے افسوں ہو
سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی　　ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی
کہ بہت دل ہے آشنائے رحم　　دردمندوں جانے جائے رحم

اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ | اس کو مدِّ نظر ہے مجھ سے نباہ
طعن و تعریض بیچ میں آئے | کچھ نہ خاطر میں وے مجھے لائے
رہتے ہیں اک طرف وفا کے لئے | چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کئے
نہیں آزار کی روا داری | مہر ورزی ہے یا وفا داری
پر جو معشوقی آب و گل میں ہے | چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے
میں کروں تو کہیں خوش آتا ہے | تیرا آزار جی سے بھاتا ہے
خواہ ناخواہ وہ نہیں منظور | کہ رہے دل شدہ مرا رنجور
یہ بھی شوخی سے ہے کہے گا ہے | پر اس انداز سے کہ جی چاہے

معاملۂ سوم

ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ | باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ
پاؤں سے ایک انگلی مل ڈالی | لطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو میں نے بیتابی | دستِ نازک سے دیر تک دابی
یاد آتے ہیں ایسے لطف جواب | گذرے ہیں جانِ غم زدہ پہ غضب
تن بدن دیکھ جی نہ رہتا تھا | میں جو گستاخ ہو کے کہتا تھا
کہ یہ جا گہہ تم اس فقیر کو دو | متبسم ہو کہتے دے یہ لو
یہ بھی کیا کیا خیال رکھتے ہیں | آرزوئے محال رکھتے ہیں
پھر گھڑی بھر میں کہتے ہو نہ ملول | مار کھانے کی باتیں سب ہیں قبول
جب سلوک ان کا یاد آتا ہے | کیا کہوں جی ہی بھول جاتا ہے

معاملۂ چہارم

ایک دن پان وے چباتے تھے
سرخ لب اُن کے مجھ کو بھاتے تھے

کہہ اُٹھا میں اگر اُگال مجھے
منھ سے دو تو کرو نہال مجھے

بولے یوں نہیں ہے میں کہا ہاں سچ
جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ

ہنس کے اس وقت مجھ کو ٹال دیا
پھر اُسی رنگ سے اُگال دیا

ایسی صد رنگ مہربانی تھی
تب سیہ رو کی زندگانی تھی

اب کے سے رنگ گر فلک لاتا
خاک کے رنگ میں مجھے پاتا

معاملۂ پنجم

منقبت ایک مجھ سے کہوایا
جس کا میں نے صلہ انھیں پایا

پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا
ایک پردہ سا بیچ میں رہتا

دوستی رابطہ وفا اخلاص
ساتھ میرے تھا ان کو رابطہ خاص

میں تقاضائی ملنے کا رہتا
مختلط ہونے کو سدا کہتا

میری تسکیں تھی ہر زماں منظور
آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور

وصل کے وعدے ہی رہا کرتے
آج کل رات دن کہا کرتے

دل تو تھا رحم آشنا از بس
کڑھتے تھے جان کر مجھے بے کس

جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ
سیّد خستہ خاک افتادہ

دیکھتے مجھ کو جو پریشان دل
کہتے اے میر کچھ نہیں حاصل

دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا
جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا

آفتِ جاں ہے دوستی کرنا کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا
میں جو دیوانہ اُن کے رُو کا تھا شیفتہ پیچ دار مو کا تھا
کچھ نہ سمجھی گئی کہسن ان کی اب جدائی جو ہے کٹھن اُن کی
یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں

معاملۂ ششم

گلرُوؤں بن جگر ہے داغ کباب گیسوؤں بن ہے جی کو پیچ وتاب
صورت ان کی خیال میں ہر دم خواب میں جو ہوں وہ مژہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اداس چاند سا منھ آنکھوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بیخود و بے خواب ایک پیکر پری کا سا ہم خواب
فرش پر پانوں یہ غبار آلود ان میں وے دونوں پا نگار آلود
میں تو افتادۂ محوِ عجز و نیاز بازو میرے کسو کی بالشِ ناز
جلق آنکھوں کے لگی ور خسار جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبر بار
پاس منھ کے وے لالِ تر نازک دستِ گستاخ بر کمر نازک
فرش اس گلبدن سے سب لوبیا پھول میں نے بچھائے تھے گویا
شب کئی صورتِ خیالی سے دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے
گرچہ روزانہ بھی تصور تھا لیکن اندوہ سے مکدر تھا
کہیں تصویر سی نظر آئی کہیں منھ پھیر جیسے شرمائی
کبھی دل ان کے رو دھو میں رہے کبھی ملنے کی آرزو میں رہے
صورتِ حال اور کچھ ہر دم گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم

میں بھی منفرد و مستک وفا کی ہے — جان غم ناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں — روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا — زن و فرزند و خانماں سے گیا
کبھی پانی ہو مینھ ہو یا برسات — روز روشن ہو یا اندھیری رات
ان تک میرے نہیں پہونچ رہنا — بیٹھے منھ دیکھنا نہ کچھ کہنا
آشنا یار سارے بیگانے — کہوئے میر جی تو دیوانے
رشتۂ ربط انھوں نے توڑ دیا — ملنا جلنا سبھوں نے چھوڑ دیا
نظر آتے نہیں ہیں مدت سے — انس پیدا کیا ہے وحشت سے
صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں — جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں
چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ — پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ
مل گیا جو کوئی تو نیچ نکلے — میر جی خبطی دیوانے سچ نکلے
شوق سے ان کے حال دیگرگوں — پارہ پارہ دل و جگر سب خوں
رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور — کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور
کیا بیاں کرے بے قراری کا — ذکر کیا حال اضطراری کا
جی پڑا تھا ترے ساتھ سونے کو — دل پریشاں جمع ہونے کو
پاس ان کے رہوں تو دل کو قرار — پھر نہ ٹھہرے تک ایک کریے ہزار
گئی برباد عزت ان کے لئے — جلف لوگوں نے منھ پہ طعنے دیئے
گھورے پر سے جو اٹھ نہ سکتے تھے — دے بھی کتا اس پوچ بکتے تھے
سفر آیا جو ان کے تئیں در پیش — ساتھ اس رنج میں بھی تھا درویش
کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں — ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں
جو پڑے گا بسنگ نامہ یاں — ہو گی ساری حقیقت اس پہ عیاں

—

یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام　　کہ محبت سے یاں ہے حرف کلام

معاملۂ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط　　ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب　　جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم وے متصل بیٹھے.　　اپنے دل خواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا جوں ہوا　　یعنی مقصود دل حصول ہوا
واسطے جس کے میں تھا آوارہ　　ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ
گہ گہے دست دی ہم آغوشی　　ہمسری ہم کناری ہم دوشی
چند روز اس طرح رہی صحبت　　پیار اخلاص رابطہ الفت
کچھ کہوں جو آنکھوں کی ہو تقصیر　　نارسائی تھی طالعوں کی میر
ہو گئے بخت اپنے برگشتہ　　پھر کیا آسماں نے سرگشتہ
بات ایسی ہی اتفاق پڑی　　کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی
لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ　　کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ
یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش　　کہ نشان بلا ہوں الفت کیش.
میں اٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ　　کہ حکومت تو ہے میری جان کے ساتھ
اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے　　کیا کروں آبرو مقدم ہے
میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش　　جیسے تصویر سامنے خاموش
آنسو آنکھوں میں بھر لیے جاؤں　　وے کہیں کچھ تو ہاں کیے جاؤں
ان سے رخصت ہوئے جو بعد تمام　　تیرہ دیکھا جہان کو ہر گام!

دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی   جان کو رفتگی کی حالت تھی
یوں ہوا ان کے کوچہ سے آنا   جیسے ہووے جہان سے جانا
اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا   چارپائی پہ ہوں تو مردہ سا
جی اٹھوں میں فسردہ قالب یاں   متحرک ہو کیا تن بے جاں
حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو   کروں پیغام کچھ جو محرم ہو
جی میں کچھ آیا رو کے بیٹھ رہا   دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا
کوئی آیا جو واں سے جی آیا   سو نہ آیا کبھی کبھی آیا
دیکھیے چندیوں رہیں گے جدا   چاہے ہے کیا ہمارے حق میں خدا
خون دل کب تلک پئیں گے ہم   رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم
آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی   دل وہی حال پرسی محبوبی
تند ہو کر نہ بات کو کہنا   ملتفت حال زار پر رہنا
لطف مبذول حال پر ہر آن   تازہ ہر دم مروت و احسان
لب سے جاں بخش حرف سے دلجو   لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو
یاد کر روؤں ان کی کون سی بات   کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات
ملنا ان سے ہو پھر گھٹے غم بھی   آئے جیتوں میں جانیے ہم بھی

مدت ہجر اگر تمام ہوئی
ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

مثنوی جوشِ عشق ۶

ضبط کروں میں کب تک آہ اب | چل اے خامے بسم اللہ اب
کر تک دل کا راز نہانی | ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستۂ غم تھا | سرتاپا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہہ | بے خود ہو گئی جانِ آگہہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت | تاب نے ڈھونڈھی اک دم فرصت
تاب و توان و شکیب و تحمل | رخصت اس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی | بے تابی نے طاقت پائی۔
کرتے آئے داغ سیاہی | کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر ہو بہنے لاگا۔ | پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا | ایک گھڑی آرام نہ پایا
چاک جگر سے محبت ٹپکی | آنسو کی جاگہہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تابہ گویا | اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اس کی مشکل جینا | درد فقط تھا سارا سینا
دل میں تمنا داغ جگر میں | شیون لب پہ یاس نظر میں
نالے شب کو اس کے سن کر | مرگئے کتنے سر کو دھن کر
آہ و فغاں ہے اس کے لب پہ | روز ہے اب تک آفت سب پہ

روئے و جبیں پہ خراش ناخن
داغوں سے خوں کے قیامت گلبن

زخم سینہ دل تک پہونچا
کوئی نہ اس گھائل تک پہونچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
فوارہ لوہو کا چھوٹا

غم نے تو دل میں کیا ہے پھوڑا
پر میں تھا اک پکا پھوڑا

سو نہ گیا یک دم وہ بے کل
بخت نہ جاگے اس کے ایک پل

کام رہا ناکامی ہی سے
تسکین بے آرامی ہی سے

رخساروں پر خون رواں ہو
دل میں ہو سو منہ پہ عیاں ہو

دشنۂ غم سے سینہ کوچا
ناخن سے منہ سارا نوچا

دل آماج گہہ غم ناکی
اور نفس اک تیر خاکی

بے طاقت نے یارا اس کو
ضعف دلی نے مارا اس کو

نالہ دل میں حزینی اس کے
خاطر میں غمگینی اس کے

رنگ اڑے چہرے کا ہر دم
تھا گویا گل آخر موسم

دست بدل ہر آن رہے وہ
بے طاقت بے جان رہے وہ

رنگ شکستہ بس کہ فسردہ
کہنے کو زندہ لیکن مردہ

خوں باری سے چہرہ گلگوں
حلق بسمل دیدۂ پرخوں

جدول جاری چاک گریباں
گوشۂ دامن وقت مژگاں

دیدۂ تر کے دریا قائل
ساحل خشک لبی کے سائل

ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خوں باری سے سیل بہاری

تشنہ لبی اک منہ پر پیدا
لب خشک جس کا ہووے نہ دریا

خاک بسر آشفتہ سری سے
شور قیامت نوحہ گری سے

سرتاپا آشفتہ دماغی
داغ جنوں دے جس کو چراغی

غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا　　جامے میں اک تار نہیں تھا
وادی پر جب اپنی آوے　　صحرہ صحرہ خاک اڑاوے
کلفت دل جب خاک فشاں ہو　　اشک کی جا گہہ ریگ رواں ہو
گل ان نے از بس کہ کھائے　　پھولوں کی جھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی　　شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ　　جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہ سرد کرے وہ عریاں　　بید سا کانپے موئے پریشاں
گرد کی تہہ اس کا پیراہن　　دامن صحرا جس کا دامن
یار دامن تار گریباں　　دامن قرب و جوار گریباں
پامالی میں مثل جادہ　　نقش قدم سا خاک افتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی　　دور کھنچی اس کی رسوائی
اس کے جو پامال ہوئے سب　　خار بیاباں لال ہوئے سب
جن نے دیکھا اس کو یک دم　　اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا　　پر مدت تک یاد رہے گا
جلنا اس سے کرے نہ کنارہ　　جیسے چراغ وقف بچارا
لوہو ٹپکے آہ سحر سے　　لالہ گتھواں لخت جگر سے
رکھتا سدا تھا وہ دیوانا　　وردِ زباں یہ شعرِ دانا
صاد فوادی شقاً شقاً　　حقاً حقاً حقاً حقاً
ہوش خرد ناشاد گئے سب　　دین و دل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ　　ہر اک کا منھ دیکھ رہے وہ
حسرت اس کی ایک اجوبا　　آب دہن کی موج میں ڈوبا

غیرے بولے نہ یاروں ہی سے
سمجھ تو کوئی داد کو پہونچو
ورنہ رہے من مار کر اپنا
کیوں کر غم سے ہو آزادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر
نے کعبہ نے دید کے قابل
کیسا کہئے کیسا کچھ تھا

بات کہے تو اشاروں ہی سے
عاشق کی فریاد کو پہونچو
سر دے مارے ہار کر اپنا
جان کے ساتھ اس کی ناشادی
اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
مذہب اس کا سیر کے قابل
القصہ وہ ایسا کچھ تھا

درصفتِ دلبرے کہ باو علاقۂ دل بود

وہ کیسا تھا جس پر عاشق
دیدۂ گل میں جاگہ اُس کی
چشم برہ سارا چمن اس کا
آگے اُس کے کبھو نہ آیا
گل آشفتہ اُس کے رو کا

جی سے تھا یہ عاشق صادق
نکہتِ گل گرد رہ اس کی
نقش قدم تھا یاسمن اس کا
یہ رو گل نے کہاں سے پایا
سنبل اک زنجیر مو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو
زلف اس چہرے پر تیرہ
دیکھ اس گل کی نورافشانی

ماہِ دو ہفتہ شرمندہ ہو
کاکل صبح سے تیرہ تر آئندہ
شمع مجلس پانی پانی

ہو ہرچند یہ بدرِ کامل
حوصلہ کتنا اس بے تہہ کا
رکھتی تھی دعویٰ خوش چشمی پر

اس چہرے کے ہو نہ مقابل
منھ دیکھو آئینہ مہ کا
لیکن اس کی چشم نظر کر

بہتوں کی جب جانیں گھل گئیں — نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں
دورِ چشم ہے اُس کا جب سے — فتنہ اک سوتا نہیں تب سے
رُخ لب سے جاں بخش عالم — بلکہ سراپا جان مجسم
عیسیٰ کو گر لب دکھلا دے — ہرگز اس کو بات نہ آوے
کوئی مرد انداز حیا پر — چشم اس کی تھی پشت پا پر
کچھ مت پوچھو تنگی دھن کی — مشکل تھی واں جائے سخن کی
کرکے شمیم زلف گذارا — پھیلا دے ہے عنبر سارا
خط آیا ہے گرد اس لب کے — شاید شکر تنگ ہوا ب کے
دونوں لب اس کے لعل بدخشاں — دست حنائی پنجۂ مرداں
تھا دیکھا ایک وہ پردے میں — برق خرمن مہ پردے میں
جس دم برقع منھ سے اٹھاتا — خورشید اس دم ڈوبا جاتا
پار دلوں کے خدنگ مژہ کا — کاوش کم کم تنگ مژہ کا
بھوں کی کشش کا زِہ دانہ عالم — تیر نگہ کا نشانہ عالم
تیغ و تبر تھی ابرو اس کی — آتشِ سرکش جو تھی آس کی
نازکی مے سے مست رہے وہ — اکثر دست بدست رہے وہ
زلفوں کے سب تار پریشاں — سر اوپر دستار پریشاں
سراپا سے اس کے سرو بنایا۔ — خاک رہی سے تدرو بنایا
ہوئے خراماں جب وہ کافر — کبک کی ہوئے جان مسافر
چشم کرشمہ جان تغافل — شایاں اس کی شانِ تغافل
کیا جائے وہ حال کسو کا۔ — پتھر دل اس آئینہ رو کا
پاتے ہی ابرو کا اشارہ — غمزے نے ایک خنجر مارا

جب وہ خراماں ناز کرے ہے
جی کو جو ر نیاز کرے ہے

رخصت دے گر عشوہ گری کو
ایک ہی جلوہ بس ہے پری کو

ہنسنے میں وہ صفائے دنداں
برق خرمن عالم امکاں

رشک سحر کو صافی تن پر
خون صراحی اس گردن پر

آہ صفائی اس سینے کی
غیرت افزا آئینے کی

شکل جبیں میں یہ ناز کہاں ہے
صورت بے انداز کہاں ہے

ابرو خوب جہاں میں کہیں ہے
رحم ہے اس پر اب جو نہیں ہے

جب وہ شکل نظر آتی تھی
کلفت دل کی نکل جاتی تھی!

رنگیں اس کی اس کف پا سے
جائیں نہ کیوں یاں اپنی جا سے

چشم کرو انصاف کی گروا
یوسفؑ و شیریں لیلےٰ عذرا

کون ہوا اس محبوبی سے
خوبی تھی پر اس خوبی سے!

بار نزاکت کیونکر اٹھاوے
شاخ گل سا لہکا جاوے

سب گا رگ گل یا رگ جاں ہے
یہ نازک اسرار میاں ہے

صید ملک قربان اس کا
یوسف اک زندانی اس کا

اور جو خوباں پا دیں اس کو
یک دیگر دکھلاویں اس کو

جا دیں اس پر جان سبھوں کی
تیغ رہے در میان سبھوں کی

تھا بنا جائے کس کے کہنے وہ
غصے ہو تو پھر نہ منے وہ

کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے
کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے

کیا ہے اس کے آب و گل میں
آرزو اس کی سب کے دل میں

سب کو میل اس بت کی ادا کا
بندہ کون رہا ہے خدا کا

دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے
پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے

عاشق ظلم و جور و جفا کا دشمن جانی اہلِ وفا کا
کوچہ رشکِ فزائے کعبہ واں پہونچے نہ دعائے کعبہ
ہر شب اک فریاد و تظلم اُٹھ گئی واں سے رسمِ ترحم
آہیں جو کی درد و نظا نف سو دل سنتے والے کے طاق

رخصت شدن یار و بیتاب شدن عاشق بے قرار

کہاں ہے خامہ وہ تحریر اب آوے زباں پہ جو تقریر اب
بیتی میں اس خستہ غم کا سر تا پا اندوہ و الم کا
بارے سفر کا رائق ہو کر حبِ وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو مجھ پاس بھی آیا جلتے تئیں زور جلایا
وقت وداع قیامت گزرا سرسے اب حسرت گزرا
اک دم بے خود ہو کے رہا وہ اس سے آگے آپ گیا وہ
آنکھیں ملیں ناسور ہو بہتے دیکھ اس کو گلا کرکے یہ کہتے
ظلم ہے لو ہو پیتے رہئے جان گئے پر جیتے رہئے
عمر عزیز یہ چلی یوں جاوے اور فلک آنکھوں سے دکھاوے
آخر کر کے خدا کے حوالا آئینے پر پانی ڈالا
تا کہ رو دکھلا دے شتابی راہ دور سے آوے شتابی

یار گئے پر تیر جواب ہے
جان سے خالی اک قالب ہے

راقم غم ہے وہ دل تفتہ نامہ بر اس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اس کو کہاں ہے قاصد اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے تر ہو یاں کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے جس سے کباب کبوتر ہووے
جب درد دل ان نے لکھا ہے شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب دھیاں پہ شعلہ اک جوں شمع زباں پر آ
جب کرے خون جگر سے انشا یار کا اپنے شوق کف پا
ہو انگشت بریدہ خامہ اور حنائی کاغذ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ دیکھے راہِ عمر گذشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے ہر دم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے مرنے قریب ہے وہ دوری سے
جب وہ درد دل کو جتاوے باتوں پہ اس کے رونا آوے
دستہ دستہ داغ بسر ہے پرکالہ پرکالہ جگر ہے
اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا ہے یہ گرہ اک دل کی تمنا
داغ دروں ہے گلشن گلشن گل یہ چنے وہ دامن دامن
چھوڑے نہ راہ و رسم وفا کو دے پیغام ہمیشہ صبا کو
پاس اس کے گر تیرا ہو جانا بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا
زیر لب اس کے بات یہی ہے شام و سحر دن رات یہی ہے
کھنچیں گے کب تک یہ سختی ہم پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم
بس اے خامہ رکھ لے زباں کو تاب نہیں ہے اہل جہاں کو

قصۂ غم کو نہایت کب ہے
اس سے خموشی اب انسب ہے

مثنوی اعجازِ عشق

ثنائے جہاں آفریں ہے محال — زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال
کمالات اس کے ہیں سب پر عیاں — کرے کوئی حمد اس کی سو کیا بیاں
کہوں کیا میں اس کی صفاتِ کمال — کہ ہے عقلِ کل یاں پریشاں خیال
خرد کنہ میں اس کی حیران ہے — گماں یاں پریشاں پشیمان ہے
زمین و فلک سب ہیں اس کے حضور — مہ و خور ہیں اس سے ہی لبریز نور
یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے — کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسو کے جو ادراک میں — سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں
بری ہے گا تمثیل و تشبیہ سے — منزہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے
وہی حاصلِ مزرعِ آسماں — کرے ان نے دانے میں خرمن نہاں
سفید و سیہ کو نہیں اس کی بار — ورے ہے زمانے کی لیل و نہار

در توحید انشا طراز یعنی کہ فقرۂ یکتائی او بعالم دویدہ

سوا اس کے نقصان ہے گر دیکھئے — کمال اس کے ہی ہیں جدھر دیکھئے
سر رشتہ ہے خلق کا اس کے ہاتھ — وہ شب بازاں پتلیوں کے ہے ساتھ
سبھوں میں نمود اس کی ہی شان ہے — یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے!

گل و غنچہ و رنگ و بو و بہار — یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار
اگرچہ سبھوں کی ہیں طرحیں جدا — یہ سب طرحیں ہیں ایک نام خدا
سما ارض و خورشید یا ماہ ہے — جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
نظر کر کے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ — نہان و عیاں سب ہیں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ ہے تمام جہاں — یہ سب عکس اس کے ہی پڑتے ہیں یاں
ملک جن و حیواں جماد و نبات — جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات
وجود عدم اس سے دونوں ہیں تماد — وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد
مجھے ساقی دے کوئی جام عقیق — ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق
رکھے آپ میں جس کی آثار مجھے — کہ در پیش ہے نعت احمدؐ مجھے

در نعت سید المرسلینؐ

ثنا جان پاک محمدؐ کے تئیں — درود و تحیات احمدؐ کے تئیں
رسول خدا و سر انبیاءؑ — زہے حشمت و جاہ صلیؐ علیٰ
دیا مجلس کبریا کا ہے وہ — شرف دودمان قضا کا ہے وہ
سب اس صفحہ میں ہیں ظہور خدا — پر اس سے عبارت ہے نور خدا
جہاں وہ ہے وہاں جبرئیلؑ امیں — اڑے حشر تک تو پہونچتا نہیں
کروں اس کی قربت کا کیا میں بیاں — کہ تھا قاب قوسین ادنیٰ مکاں
مرا زیر پا اس کے فرق نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز
بصورت اگر عبد مشہود ہے — حقیقت کو پہونچو تو معبود ہے
نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر — محمدؐ بنا اور آل بن اس کے میر

گنہگار ہوں چشم ایک اس سے ہے　　توقع شفاعت کی ایک اس سے ہم
درود آل پر اس کے ہر صبح و شام　　وہ ہے شافع حشر خیر الانام
پلا ساقیا بادۂ لعل گوں　　کہ ہو جائیں سرخ آنکھیں مانند خوں
ہے اب حرف مستانہ کہلو میں جوش　　کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

مناجات بطور عاشقانِ زار در بلائے جدائی گرفتار

مرا زخم یارب نمایاں رہے
پس از مرگ صد سال خنداں رہے

رہے دشمنی جیب سے چاک کو
صبا دوست رکھے مری خاک کو

مژہ اشک تو نیں سے سازش کرے
غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے

جگر سے تپیدن موافق رہے
مرا درد دل مجھ پہ عاشق رہے

جو نالہ ہو شب گیر کار و شناس
وہ آنسو ڈھل پہریا رہے میرے پاس

مژہ گرمِ افسوس و نم ناک ہو
کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو

کرے نیزہ بازی یہ آہِ سحر
کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو
اُڑے پر لگا کر مرا رنگ رو

نہ مرہم سے افسردہ ہو داغِ دل
شگفتہ رہے یہ گلِ باغِ دل

سدا چشم حیرت سے نسبت رہے
مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے

اگر ضعف تک کسب طاقت کرے
مری ناتوانی قیامت کرے

مری بے کسی ناز بردار ہو
مروں میں تو مرنے کو تیار ہو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دل پر کو خالی کروں

کریں دونوں عالم ملامت مجھے
ڈبو دیوے اشک ندامت مجھے

مرا ہاتھ ہو چاک کا دست یار
کہ تا جیب دامن ہو قرب و جوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وارہی
بھلا دے خضر کو مری گمرہی

جو ہو گرم رہ پائے پُر آبلہ
تو ہو جاوے سرد آتشِ قافلہ

ارے ساقی اے غیرتِ آفتاب
کہاں تک پلیں خونِ دل کی شراب

مجھے ساغرِ بادہ کا دیدار ہو
محرّم ہمارا کبھو عید ہو

درتعریف عشق خانماں آبادآزادگاں برنہاد

زہے عشق نیرنگ سازی تری ۔ کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری

تجھی سے ہے آبِ رخِ زرد زرد ۔ تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفار و دیندار سے ۔ تجھے رشتہ تسبیح و زنّار سے

تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری ۔ تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے ۔ ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دل شاد غمناک ہے ۔ تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تو نے کیا ہے شہید ۔ تجھی سے نہ بر آئی میری امید

تجھی سے ہے مجنوں صحرا نورد ۔ تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد

تجھی سے گلو بند ہے خستگی ۔ تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی

تجھی سے دل عاشقاں ہے کباب ۔ تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں ۔ تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں

تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ ۔ تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں ۔ تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا ۔ و لیکن ترا راز رسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے ۔ ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

ترا ہی نمک خوار ہے زخم دل ۔ کہ مرہم سے بیزار ہے زخم دل

تجھی اک ہی مژگاں سے یہ ربط اشک ۔ کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبط اشک

کدھر ہے تو اے ساقیا لالہ فام ۔ نہ لغزش ہے تجھ بن کہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خون دل کو پیے ۔ کوئی کیوں کہ اس رنگ ظالم جیے

زبانی درویش جگر ریش کہ ایں بلا در سر آمد

کسو معتبر سے روایت ہے اک ۔ کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک

کہ اک ملک میں میں قضارا گیا ۔ جواں ایک واں مفت مارا گیا

وہ جس طور مارا گیا اب کہوں ۔ تعجب میں اس کے کہاں تک رہوں

سن اب آ جو کچھ اس کے جی پر ہوا ۔ مصیبت زدہ بن اجل ہی موا

اٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز ۔ پشیمانی اس کی ہے مجھکو ہنوز

نظر جا پڑی جو مری ایک سو ۔ سر راہ بیٹھا تھا اک خوب رو

فقیروں کی سی جھولی ایک اس کے پاس ۔ بدن میں نہایت مکلف لباس

سراد پر تھا ہنگامہ اک اس کے جمع ۔ پتنگے اکٹھے ہوں جوں گرد شمع

لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا ۔ کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل ۔ کرے جس کی خاکِ قدم غازۂ گل

اسی کی سی مقدور تک سب کہیں ۔ سدا اس کا منھ دیکھتے ہی رہیں

ایک دود دماں کا تھا روشن چراغ ۔ جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ

ولے اس کے دل میں اک آتش نہاں ۔ کہ دیکھیے جلا اس سے سارا جہاں

سب آرام جا ہیں اسے اضطرار ۔ سراپا تلک ایک دل بے قرار

نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اس کو تھا ۔ تشتت نہ مر جانے کا اس کو تھا

نہ طاقت تھی تن میں نہ کچھ جی میں تاب ۔ نہ دل پاس نے صبر و آرام و خواب

سرِ راہ دل قیمہ قیمہ کیے ۔۔۔ یہ کہتا تھا مرجائیے بس جیے
سُنی اس نے گل کشتگی بے کلی ۔۔۔ رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی
دل و صبر و ہوش و توان و حواس ۔۔۔ رہیں اس کی وحشت سے سارے اداس
شب و روز فریاد کرنا اسے ۔۔۔ کئی بار اک دم میں مرنا اسے
تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا ۔۔۔ زمانے کو چندے تماشا ہوا
جو دم لے تپش تو شتابی کرے ۔۔۔ تسلی دل کی خرابی کرے
کرے طرح داغوں سے وہ باغ کو ۔۔۔ روانی اسی سے زر داغ کو
دل غمزدہ سے محبت اسے ۔۔۔ قیامت خوشی سے عداوت اسے
وہ بیتابیوں سے بہت کم فراغ ۔۔۔ کہاں صبر کرنے کا اس کو دماغ
اٹھی اس کے جی سے فغاں کی شرر ۔۔۔ وہی برچھیاں سہتی آہ سحر
وہ ہر چند ہر صبح کو ہو ملول ۔۔۔ ولیکن دعا اس کی کیا ہو قبول
نہ آنسو کو اس کے تھی اس پر نظر ۔۔۔ نہ آہ سحر میں تھا اس کے اثر
کہے رنگ رو کیوں مرا زرد ہے ۔۔۔ رکھے ہاتھ دل پر کہ کچھ درد ہے
کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز ۔۔۔ بدے لخت دل رونے کی کچھ نیاز
وہ کاندھے پہ نعش تمنا کے تئیں ۔۔۔ کرے تعزیت خانہ دنیا کے تئیں
سنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے۔ ۔۔۔ بیاں اس کا کچھ گومگو ہی رہے
لے آ ساقی گر بادہ کا شوق ہے ۔۔۔ کہ سیہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے
کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق ۔۔۔ کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق

رفتن درویش بپیش آں جواں رفتہ از خویش و دلدہی کردن او بیش از بیش

یہ قصہ جہاں میں فسانہ ہوا مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا
ولے گاہ وہ شمعِ مجلس فروز کئی بیتیں پڑھتا تھا وہ سینہ سوز
کہ جن کا یہ مضمون تھا داستاں جلے ہیں گی تقریر کرتے زباں
بڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں جگر کیوں نہ جل جائے آتش بجاں
نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی
زن و مرد کی ہوں زباں سے بتنگ ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ
سدا خونِ دل میں طپیدہ ہوں میں کہ آہ بلب نارسیدہ ہوں میں
تری دوری میں یاں پہنچی ہے اے حبیب وداعِ دمِ واپسیں ہے قریب
جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ
سمجھنا یہ بھی اے مرے سر پہ خاک کس امید پہ میں ہوا ہوں ہلاک
تو جب سے دراو پر نظر آ گئی یہ ہیں آفتیں میرے سر پہ نئی
نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ
دل و دیدہ سب آزمی ہو گئے تماشائی مجھ پر بہت رو گئے
کئی بار جاں لب پہ آ پھر گئی کہاں ہے تو اے گل ہوا پھر گئی
یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں تصور ترا جی سے جاتا نہیں
خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد
رہا کرتی ہے دادِ بیداد یاں دل شب سے گذرے ہے فریاد یاں

سر رہ تک آ دیکھ یہ خستہ حال — کہ ہے نقشِ پا کی طرح پائمال

ترے دور غم میں تو جوں کیمیا — مٹتا ہی گیا نام مہر و وفا

نہ آنا نظر ہی ادا ہے و لیک — نہ اتنا کہ جاتا رہے جی سے ایک

ترے غم میں اے آفت روزگار — ہزاروں بلائیں ہیں یاں روبکار

کہاں ہے تو محمل نشینِ حیا — سرِ راہ نالاں تھا مثلِ درا

کہہ اس طرز سے حال دل کا تمام — خموشی کو پھر اس نے فرمایا کام

کہاں ہے تو اے ساقیٔ گلعذار — کہ دے مجھ کو جام مے خوشگوار

لکھوں قصۂ عشق بے کیف و کم — قلم بے خودانہ کرے کچھ رقم

مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی — کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی

گیا زہرۂ تاب دل آب ہو — کہا آگے جا کر میں بے تاب ہو

کہ اے نازپرور درد مہر و وفا — کوئی اپنے جی پر کرے ہے جفا

خلل ہے کہ جی ہے تو ہے گا جہاں — وگر نہ موے پر ہے کیا میری جاں

تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی — نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی

تہہ دل ہو معلوم تا بول ٹک — تو مژگاں خوں بستہ کو کھول ٹک

سخن حسرت آلود کہنے پہ آ — کچھ اک دل کی باتیں زباں پر بھی لا

وگرنہ تو گڑ کے مر جائے گا — یہ ہے عشق کام اپنا کر جائے گا

تو ہے صرصرِ غم سے آتش بجاں — دیا سا نہ بجھ جائیو اے جواں

تو اے شمع خامش زباں ٹک ہلا — کہ کس مجلس افروز سے تو جلا

تو کس آتش تند پر ہے سپند — ترا درد دل یہ ہوا ہے بلند

جلاتی ہے آتش تری میرے تئیں — کیا داغ کس شعلے نے تیرے تئیں

گھٹا پاتے ہیں تجھ کو ہر صبح و شام — نہ کاہیدہ ہو تو ہے ماہِ تمام

ترا درد پنہاں ہے گو آشکار ‏ یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں رازدار
کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ ‏ کہوں اس سے جا کر غمیں تو نہ رہ
جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں ‏ کہے کام جو تو بجا لاؤں میں
جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار ‏ کروں میں ملک کی طرح واں گذار
خدا جانے کیا جی میں بات آگئی ‏ کہ یہ میری دلجوئی ہی بھا گئی
یہ سن کر جوان ز خود رفتہ نے ‏ جگر سوختہ اور دل کفتہ نے
کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود ‏ زباں تاب کھانے لگی جیسے دود
سخن ہونے لاگے نمودار کچھ ‏ لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ
کہ جن سے یہ معنی ہوئے مستفاد ‏ کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد
جو دلجوئی میری ہے مدّنظر ‏ تو یاں اک محلّہ ہے ٹک قصد کر
نہیں اس کو درکار کچھ جستجو ‏ سرا ایک ترسا کی ہے قبلہ رو
زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ ‏ کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ
ترے واسطے خوب رسوا ہوا ‏ مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا
تسلی شکیبائی مطلق نہیں ‏ پر اب تاب تنہائی مطلق نہیں
رہی جب تلک تن میں تاب و تواں ‏ اٹھایا تحمل کا بار گراں
شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق ‏ کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق
ہوا آخر اب دل کا سب خونِ ناب ‏ پیوں کب تلک اک گلابی شراب
کہے ہے جوان کے غرض قصد کر ‏ گیا بندہ ترسا کے دروازے پر
سُن آواز دستک کی اک رشکِ حور ‏ نہ چار دہ سی بنت با شعور
دو چار آکے مجھ سے ہوئی ایک بار ‏ گیا جس کے دیکھے سے صبر و قرار
ہوئی دیکھنے سے جب حقیقت عیاں ‏ کہا میں کہ تاجر پسر تھا جہاں
بشر کیا کہ دیکھے ایسی آفت کے تئیں ‏ فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کے تئیں

کہا میں نے پیغام جو آیا بن یہ خوبی ہے اس کی کروں کیا سخن
مژدہ بخت عاشق کی برگشتگی نگہ ایک عالم کی سرگشتگی
قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں
وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی قیامت بھی آتی جلو میں چلی
میں سودائی اس زلف تاریک کا ہر اک مو سبب رنج باریک کا
شکن اس کی کاکل کا دام بلا ہر اک حلقۂ زلفِ کامِ بلا
بھوؤں کی کمانوں سے لگ زلف تا الٹتے تھے اڑ اڑ کے جوں تیرِ نا
اگر ابرو اس کی جھپک جاتی تھی مہ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی
ملے اس کے ابرو جدھر کرکے ناز کرے اس طرف ایک عالم نماز
کماں اس کے ابرو کی عاشق کمیں خدنگ اس کے مژگاں کی سب دلنشیں
نہ آنکھوں کی مستی کی اس کو خبر خرابی نہ عاشق کی مد نظر
نگہدار تھی سرخی چشم کی طرف دار تھی اپنے ہی خشم کی
شہید اس کے چشمک کے دل خستگاں نشانے نگاہوں کے دل بستگاں
مژہ موجب قتل جمع کثیر غرض سب تھے یہ ایک سرکش کے تیر
چھپیں اس کے غمزے میں کشتی سناں نمایاں ہوئے سب پہ مرگ جہاں
جبیں کھول دی اس پری زاد نے کہ چیں مانی خوبان نوشاد نے
رواں اس شب افروز سے رشک شمع یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشک شمع
وہ مردوں کو زندہ دوبارا کرے مسیحا جہاں سے کنارا کرے
پری منفعل رنگ رخسار سے خجل کبک انداز رفتار سے
خضر تشنہ اس کے ہے دیدار کا مسیحا شہید اس کے بیمار کا
سوا اس کی باتوں کے سب یاتیں ہیں جسے سن کے مردے بھی جی جاتے ہیں

غرض اور سب یوں نہیں کہنے کو ہیں　　مسیحا کے لب ہو نہیں کہنے کو ہیں

لب سرخ اس کے وہ گلبرگ تر　　چھپیں جو ہے، ذراں کے سنگ گہر

تبسم میں اپنے وہ برق بہار　　دم حرف ہادتے گئے آب دار

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم　　سخن رہرو راہ تنگ عدم

نہ دیکھا کسی نے جو تن اس کا صاف　　نظر گر نہ ٹھہرے تو کیجیے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے　　مگر صاحب دست غیب اس کو پائے

نہ رنگ صفا ہی فقط تن پہ تھا　　کہ مینا کا خون اس کی گردن پہ تھا

کیا آن نے پامال فتنوں کا خون　　حنا اس کے ہاتھوں میں کتنوں کا خون

ادا اس کی عاشق کے جی کی بلا　　نہ میری تمہاری سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام　　تو معلوم ہے پھر جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آگئی　　قیامت ہو گویا ادھر آگئی

اسے لغزش پا ہے ناز سے　　وہ مست سرانداز انداز سے

نہ ہووے وہ دن جس میں ہووے نقاب　　چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

اسی ہٹ کا ہر اک تئیں ذکر ہے　　خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

چڑھا دے اگر ہاتھ سے آستیں　　تو پھر دست موسیٰ بھی کچھ ہے نہیں

ہوئیں طرح اس سے جفا کاریاں　　نکالی ہیں ان نے دل آزاریاں

ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے　　ستم اس کے کوچے سے بچکر چلے

جو آمد ہو اس کی نصیب چمن　　کرے ترک گل عندلیب چمن

گلی اس کی فردوس کا تھی شرف　　بہشت اک گنہگار سی اک طرف

زمیں اس کی یک دست گلزار تھی　　نسیم چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتل گاہ عجیب　　شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب

وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں　　اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں

صبا گر اڑا دے تنک واں کی خاک　　تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک

کئی نعرہ کش واں کئی نعرہ زن　　کئی خوں گرفتہ کئی بے کفن

کئی بے وطن واں سفر کر گئے　　سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے

ہر اک جان بر شخص ناکام کی　　ہوا دار اس کے لبِ بام کی

پھروں گرد ساقی نشے میں ترے　　گلابی ہی منہ کو لگا دے مرے

مجھے مست آپ سا سیہ دیکھ کر　　چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب اوپر

سنا وہ جگر سوز پیغام جب　　سکئے آشنا حرف سے لعل لب

پڑھی اک رباعی یہ کر اعتبار　　کہ مضمون جس کا یہ موزوں ہے یار

کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے　　سرِ راہ فریاد و زاری کرے

نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو　　بھلی مرگ ایسے فرومایہ کو

محبت کی رہ میں نہ یہ پہلا ہے کام　　کہ سر سے گذر جائیے شاد کام

نہیں شرط الفت میں چینِ جبیں　　اگر پیش آوے دمِ واپسیں

جو چھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ　　وہ بے دم میں واماندۂ قافلہ

نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال　　تو بہتر ہے ہونا ہی اس کا وصال

گیا میں جواب اس سے لے کر ادھر　　سرِ راہ تھا پائمالِ غم وہ جدھر

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی　　جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جاں　　گرا خاک پر ہو کے بے دم جواں

سکے تھا مگر وہ سفر کر گیا　　کہ اک بات کی بات میں مر گیا

نہ دیر اس کو ہوتے ہوئے جی سے سیر　　مجھے بات کے کہتے لاگی بھی دیر

مری بات میں زار بلبل ہوا　　دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا

میں یہ واقعہ دیکھ گھبرا گیا
کہ یوں یہ گلِ تازہ مرجھا گیا

نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس سوا
کہ کریئے بیاں طُرفہ ثانی سے جا

ملامت کروں اس کو میں اک جہاں
کہ اے بے حقیقت گو اس کی جاں

ترے نازِ بیجا کا تو کیا گیا
پر اک بے گنہ اس میں مارا گیا

رہی گھر میں خوبی کہ تجھ کو نظر
سرِ رہ گیا ایک جی سے گذر

کفِ خاک اس کی ہے ذلت کا باب
تری آستاں بن یہ ہے گی خراب

یہ ٹھہرا ادھر میں روا نہ ہوا
ادھر مرنا اس کا فسانہ ہوا

پلا ساقیا ماہ وش ایک جام
گیا کاسۂ تن ہی میں ماہِ تمام

کہاں ہے وہ خونِ کبوتر سی مے
کرے کر فغاں کیجئے شغلِ نے

غرض جوں توں کر قطع میں راہ کی
گیا تھی جہاں منزل اس ماہ کی

کی آواز دستک کہ بابِ دِگر
ہوئی گھر میں القصہ میری خبر

درِ خانہ پر آئی ایک پیر زن
لگی کرنے عشق: بواں سے سخن

کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تو
شگوفہ مگر اور لایا ہے تو

کوئی رہ گیا تھا پیام جواں
جو تو پھر شتابی سے آیا یہاں

بیاں کر جو کہنا ہو تجھ کو شتاب
کہ ہے منتظر غیرتِ آفتاب

کہا میں نے اے پیر زن کیا کہوں
عزادار اس نوجواں کا میں ہوں

پیام اس کا لایا تھا میں اس لئے
کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیئے

سو یاں سے گیا ایسا لے کر جواب
کہ جس سے نکلتا تھا ناز و عتاب

نہ تھی تاب حرفِ درشت اُسکے تئیں
کیا غم نے تھا نیم کشتہ اس کے تئیں

نہ مشغول یونہیں وہ زاری سے تھا
وہ بے تاب بے اختیاری سے تھا

نہ سمجھی یہ رشکِ پری اُس کے تئیں
دکھائی دی عشوہ گری اس کے تئیں

چڑھا ان نے تیوری اک انداز سے | کہا بے خبر ہو کے یوں ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب | شتابی سے مرنا ہے اس کا صواب
ہوا سامنے اس کے میں حرف زن | یہ اس کی زباں سے کہا میں سخن
جواں سنتے ہی کر کے ایدھر نگاہ | سفر کر گیا جان سے بھر کر آہ
یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں۔ | خبر اس کے مرنے کی لایا ہوں یاں
کہہ اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جاں | گیا آخرالامر جی سے جواں
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا | کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گذرنے لگی دل سے آواز آہ | لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی | کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبت نے کام اپنا پورا کیا | کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا
فقیر آن کر سخت نادم ہوا | کہ میرے سبب دونوں کا جی گیا
یہ بھا جائے گر یہ ہے ساقی ستا | کہ بدلے گزک کے ہے یاں دل بھنا

تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں
برنگِ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولۂ شاعر

عجب کہ نہیں جانا نہ کھا پیچ و تاب — یہ میر اب جو ہے عشق خانہ خراب
سنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا — پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا
عزا کا ہے مجنوں کو نوحہ پڑا — سیہ خیمہ لیلیٰ کا بھی ہے کھڑا
گئی جان وامق کی کس رنگ سے — ہوا خاک، عذرا کا سر سنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے ادھر — دمن سے بگولہ زمیں کے اوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے — بہت اٹھ کے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں — چراغوں سے اک دود دل ہے کشاں
ہے بیتاب ذرہ اسی سے کباب — جلے ہیں اسی آگ میں آفتاب
دل اس داغ سے مہ کا جلتا ہی ہے — کتاں کا جگر چاک سنتا ہی ہے
سیہ رنگ اگتا ہے سرو سہی — وہی رنگ قمری ہے خاکستری
بھنور کے بھی جی پر پڑے گل گئی — کنول کی کھلی آنکھ پھر مند گئی
کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار — خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار
کہیں ساقی دے آب گل رنگ کو — کشادہ بھی کر اس دل تنگ کو

گلے لگ کے مینا کے ٹک رو دیجئے
فسانہ بھی آخر ہے اب سوئیے

مثنوی خواب و خیال میرؔ

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے ۔ کہ احوال اپنا تو معلوم ہے
رہیں جان غمناک کو کاہشیں ۔ گئیں دل سے نومید سو خواہشیں
زمانے نے رکھا مجھے متصل ۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل
گئی کب پریشانیٔ روزگار ۔ رہا میں تو ہم طالع زلف یار
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی ۔ نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی
اٹھاتے ہی سر پر پڑا اتفاق ۔ کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق
جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ ۔ دکھانے لگے داغ بالائے داغ
زمانے نے آوارہ چاہا مجھے ۔ مری بے کسی نے نباہا مجھے
رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی ۔ غریبی نے اک عمر کی ہمرہی
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا ۔ غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آہ بار سفر ۔ کہ نے زاد رہ کچھ نہ بار سفر
دل اک سو پے قرار بتاں ۔ غبار سر رہ گذار بتاں
گرفتار رنج و مصیبت رہا ۔ غریب دیار محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی ۔ در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیوں کر کروں ۔ مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دل مضطرب اشک حسرت ہوا ۔ جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
کھنچا ساری رہ دامن چاک دل ۔ رہا بر قفا روئے غمناک دل

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرق بحر تحیر رہوں
کبھو سر بجیب تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑے
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے

مہ چار دہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقش درست
لگی ہونے وسواس سے جاں سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اس طرح
بحدے کہ آجائیں ہونٹھوں پہ کف

رہی فکر جاں میرے احباب کو
اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو

ہوئے پاس کوئی تفاوت سے ہو
سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی فرط اندوہ سے گریہ ناک
گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کبھے چشم بندی کو ہر بار غیر
ولے منزل دل میں اس مہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہو ولے بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گرد غش چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفت روزگار دراز

عجب رنگ پر سطح رخسار کا — مگر وہ تھا آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اس کی بینی سے جا کر لڑے — دم تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کنج لب خواہش جان کا — تبسم سبب کاہش جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ — سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگہ اس کسو کے لیئے — جو سیب ذقن اس کا بو کر جیئے

گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو — خجل مشک ناب اس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجیے — وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہو — کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کہیں نقش دیوار دیکھا اسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اسے

کہیں دل بری اس کو در پیش ہو — کہیں مائل خوبی خویش ہے

کہیں جملہ تن مہر صرف سلوک — کہیں مجھ سے سرگرم حرف سلوک

لطافت سے یک جان ہووے تمیز — سبک سیر مانند عمر عزیز

کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز — کہیں ایستادہ بصد رنگ ناز

ہر اک جا سے لے ناز سے وہ سبق — در و بام تصویر کا سا ورق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو — رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو

بغل میں کبھو آرمیدہ رہے — کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے

کبھو صورت دل کشی اپنی دکھلائے — کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے

کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں — کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ — کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو — طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنس کے بات — کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہاتھ ڈالوں وہاں کچھ نہیں — بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی — اسی شکل وہمی سے صحبت رہی
دم صبح ہو گرم رہ سوئے ماہ — کہ در پیش آوے یہ روز سیاہ
کہ تجھو ماکروں بید مجنوں کی طرز — رہے یاد اس سرو موزوں کی طرز
رہوں زرد ہیں گاہ بیمار سا — پریشاں سخن میں پر بیدار سا
پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھائے — کسو سے کوئی جا کے تعویز لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلاف مزاج — کھنچا اس خرابی سے کار علاج
کہ سر رشتہ تدبیر کا گم ہوا — دل اوپر ہجوم توہم ہوا۔
دروں خود بخود بیخو اسی رہی — پریشاں دلی اور اداسی رہی
کروں بے کلی جاؤں تا ہر کہیں — نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں!
قیامت جنوں کار ہے سر میں شور — کھنچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور
رہے شوق سر در گریبان دل — ہوا کھینچے صحرا کو دامان دل
سر آشفتہ زلف گرہ گیر کا۔ — قدم حلقہ در گوشش زنجیر کا
جنوں آہ در پے ہوا جان کے — بجوز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے — کہ آتش جنوں کی مگر داں بجھے
لب نان اک بار دینے لگے — دم آب دشوار دینے لگے
کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ — ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ
نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے — کہ کیا جانئے کیسی صحبت بنے
وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور — نہیں رابطہ مقتدائے شعور
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر — در اس کا نہ کھلتا تھا دو دوپہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا   تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا
سرِ شام بیٹھا تھا میں اک روز   افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی   مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچند کھینے کو خوں کم کیا   لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا
بڑی دیر تک خون جاری رہا   میں بے ہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سحر مجھ کو اک شور سے   کھلی آنکھ میری بڑی زور سے
وہی دست فصاد میں نشتر   وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر
وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر   وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر
لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں   چبھے جیسے مژگاں کسو کے تئیں
ہوا خون سے دامن و جیب تر   رگِ جاں تلک زخم پہونچا مگر
ٹپکتا رہا دیر تک خونِ ناب   مجھے لے گئی بے خودی کی شراب
سمجھی ضعف سے سخت دشوار تھا   پلک کا اٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا   خمار ایک مدت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر پانوں لغزاں رہے   بدن بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پانوں تھر تھر کرے   نسیم سحر کا بدِ صرصر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی   اقامت گئی یوں کہ گویا نہ تھی۔
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں   نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر   کیا طاقتِ رفتہ نے منھ ادھر
کسے تھا مری زندگانی کا دھیان   ولیکن نہایت تھا میں سخت جاں
لگی جان سے آنے اعضا کے بیچ۔   کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت دور سے   کہ نزدیک تھا عالم گور سے

غلط کاریٔ وہم کچھ کم ہوئی ‏ ‏ وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی ‏ ‏ لگی کرنے در پردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی ‏ ‏ نہ دو دو پہر منہ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے ‏ ‏ غریبا نہ سر مارے دیوار سے
کہیں تھک تسلی کہیں بے قرار ‏ ‏ کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خون ‏ ‏ کہیں دست زیر زنخ بے ستون
کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے ‏ ‏ مری بے وفائی جتاوے مجھے
کہیں دست بر دل وہ رشک قمر ‏ ‏ کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں بے دماغانہ سرگرم ناز ‏ ‏ کہیں آتش شوق سے جانگداز
کہیں چشم گریاں سے داماں پاک ‏ ‏ کہیں سو جگہ سے گریباں چاک
کہیں کام دل کی شکایت سے ہے ‏ ‏ کہیں نقش دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے ‏ ‏ کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں ‏ ‏ کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے ‏ ‏ کہ یہ درد دل ہے تو مٹ جائیے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب ‏ ‏ کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب
کہیں حرف زن اس طرح ناز سے ‏ ‏ کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے ‏ ‏ کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے ‏ ‏ کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے ‏ ‏ کبھو تو کہ بیزار ہے جان سے
کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے ‏ ‏ کہ شرم محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے ‏ ‏ کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے   کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر   محبت کی بھی منھ سے کچھ شرم کر
کبھو وہ تبخستہ کی پروا نہیں   کبھو کیوں کہ کہیئے کہ سودا نہیں
کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد   کہ اے بے وفا حرف من یاد باد
کہ ظاہر میں میر اب توانا گیا   کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا
غرض ناامیدانہ کر اک نگاہ   وہ نقش تو ہم گیا شوخے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح   نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح
مگر گاہ سایا سا مہتاب میں   کبھو وہم سا عالم خواب میں
دل خو پذیر وصال دوام   رہے خواب میں روز و شب صبح و شام
اگر وصل خواب فراموش تھا   ولیکن وہی خواب کا جوش تھا
پلک سے پلک آشنا ہے وہی   زخود رفتگی کی ادا ہے وہی
کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں   رگِ خواب دل ہے کف شوق میں
جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھے   وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے
خیال اس کا آوے کہ سن ہو رہوں   تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں
مجھے آپ کو یوں ہی کھوتے گئی   جوانی تمام اپنی سوتے گئی۔
دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں   نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں
بہت بے خود و بے خبر ہو چکا   ہم آغوش طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

مثنوی در بیان ہولی

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

جشن نوروزی اہل ہند سب
ہے یہاں تب محو عشرت ہیں گے اب

شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں
صحن دولت خانہ رشک بوستاں

اس چمن میں باغ پر گل سرخ و زرد
نکہت گل جھاڑیں گے واں آ کے گرد

پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر
لالہ و صد برگ سب باغ نظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گلدستے تھے جوؤں پر رواں

زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس
عطر مالے سبھوں میں گل کی باس

رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھوار
رنگ باراں تھا مگر ابر بہار

مرغ گلشن لکھ رخسار کو جان پھول
بیٹھتے ہیں پاس آ کر پھول پھول

قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہے لال

برگ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر
تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر

روشن الدولہ نے کی تھی روشنی
کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی

وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک
تھے تماشائی گدا و شاہ تک

راہ میں تر پو لئے مینار تھے
روشنی کے کوچہ و بازار تھے

گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا
اس روش کی دھوم کا ادوم نہ تھا

اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں
دیکھو تو ہر مجلس کا آدم ہے یاں

ٹٹیاں دریا کے باندھیں دوطرف کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
تھا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے رات دن تھی روشنی کے نور سے
کوچہ و بازار و بام و در بنے روشنی کے دونوں رستہ گھر بنے
سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں پیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
آئے کس کس رنگ سے دامن سوار باڑ کے رنگوں جھنڈوں کا تھا گذار
ہاتھی آئے کو نہ پیکر کیا بنے روشنی کے دونوں رستہ گھر بنے
کیسی کیسی دیکھیں شکلیں تازیاں سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں
اُن دیوں کے عکس سے دریا کا آب آئینہ کے سطح کی رکھتا تھا تاب
کشتیوں میں جو دیئے بھر کر چلے پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے
منعکس تھے جو چراغاں تہہ تلک آب کی وسعت تھی پر نجم فلک
کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں ذو ذنب جیسے ستارے ہوں عیاں
جا ہی جو ہی چھوٹنا ہے یا دیود روشناں ذو ذوانب تھے نمود
گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ دوطرف جیسی طرح سے جھڑتی ہے باڑ
اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے ناگہاں جو ہو ویں تارے ٹوٹتے
دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں شعلے تھے لہروں کی پیچ و تاب میں
ہر دو جانب چن گئے ناری انار گلفشانی سے انھوں کی تھی بہار
ماہتابی اک طرف سے جو دغی چاند سا نکلا ہوئے حیراں سبھی
آفریں صناع لوگو آفریں کیا لگایا باغ آکر کاغذیں
گل کتر کر پھول گل ہی کر دیئے رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیئے
متصل تو پیں ستاروں کی دغیں لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں

دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں　　تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں
نذر کو نواب کی اہلِ فرنگ　　لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گل ریزی سے گلشن ہوگیا　　چرخ ان تاروں سے روشن ہوگیا
واسیاں تو بیں ہوائی ایک بار　　پھیلے تارے آسماں پر بے شمار
کیا ہوائی باد میں لہرا گئی　　تارکی سانپوں کے سے من پھیلا گئی
کیا ہی آتش دستیاں دے کر گئے　　شعلے سے پانی کی لہریں بھر گئے
رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے　　تہ بساطِ آبِ دریا آگ ہے
لکھ غزل اب میر رنگیں تو کوئی　　سن کے ہو محظوظ جس کو ہر کوئی

کپی کا بچہ

تھا کپی کا بچہ اک درویش پاس — باش و بود اس کی تھی کچھ دلریش پاس
اس قلندر نے بحسب احتیاج — بیچنے اس کو نکالا لا علاج
میں نے اس کو ایک جا دلوا دیا — مول ٹھہرا تھا جو کچھ سو لا دیا
بوزنہ یا کوئی تحفہ دہر کا — عزت افزا بندہ این شہر کا
نام منوا اس کا اب مشہور ہے — شوخی اس کی ہر کہیں مذکور ہے
ہے ہنومانی نسب یہ باب دیدہ — قائل وصف اس کے حضرت بوحمید
ہے جو لکھنؤ بندری مشہور اب — اس کی جد مادری تھی بوالعجب
اس کے پردادا نے ہی یہ حرف دی — ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی
ایک چنچل ہے بلائے روزگار — ہاتھ رہ جائے تو پا سرگرم کار
ہے تو بچہ سا ولیکن دود ہے — پست اس کی جست کا لنگور ہے
کیا کوئی انداز شوخی کا کہے — ہو معلق زن تو آدم تک رہے
اچپلاہٹ اس کی سب معلوم ہے — معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے

ہوتے ہیں قزاد کب دیکھے سے سیر — اچھلی اس کی رہے ہے یاد دیر
حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب — پر ضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو چوب
ورنہ بوٹا سا جو قد ہے جھاڑ ہے — کنگھا نچنا ہے کپڑے پھاڑ ہے
لونڈی باندی سب کو اس سے احتراز — ڈرتے اکثر بی بیوں سے دل گداز
یہ جو چاہے چھوٹنے تو تدبیر کیا — ریشمی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا
ربط اسے جس سے ہے اس سے ربط ہے — مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہے
جب وہ چھوٹے شور و ہنگامے رہیں — اب تو چھوٹا اب تو چھوٹا سب کہیں

چھوٹتا ہے گر پڑے کوئی بجوگ   بندروں سے ناچتے پھرتے ہیں لوگ با

ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد   آدم و حیواں میں یہ برزخ ہیں بد

طنز ہے یہ بات اگرچہ ہے کہی   جو کرے انسان تو بوزینہ بھی

لیکن اس جا گہہ تو صادق ہے یہ قول   سارے اس کے آدمی کے سے ہیں ڈول

ہے تماشا آئینہ کے روبرو   عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو

دیکھنا جھک جھک کے اس کا ہو نہ ضبط   آرسی بندر کا ہے مشہور ربط

گاہ بوسہ گاہ غرغر بولنا   گاہ آنکھیں موندنا گہہ کھولنا

آگے تھا اک بوزنہ شطرنج باز   چال سے اس کی نکلتا امتیاز

کہنہ قرادوں سے ہم کو یاد ہے   یہ اسی فتان کا داماد ہے

جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے   سہتے ہیں چاول پڑے اس کے گنے

آنکھ کب دوڑے ہے اس کی ہر طرف   ہے یہ اپنے نوع کا فخر و شرف

الغرض منوا عبارت جاں سے ہے   نام اس دل کش کا منوا یانے ہے

خوش رہے منوا تو خوش احوال میر   ورنہ آدم ہے جوانی میں بھی پیر

دہر میں یارب نہ یہ محزوں رہے   جس کا منوا ہے اسے میموں رہے

مثنوی موہنی بلی

ایک بلی موہنی تھا اس کا نام
آن نے میرے گھر کیا آکر مقام

ایک دو سے ہو گئی الفت گزیں
کم بہت جانے لگی اٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

آئے ہے مجھ پاس یہ اٹھ کر سویر
گریۂ زرد فلک نکلے ہے دیر

یعنی وقت گرگ و میش آنے ہے پاس
پھر مرا پہر دن سا کیا ہے ان نے پاس

چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

بختوں سے ٹوٹا ہے چھینکا بھی اگر
آن نے اُدھر کی نہیں مطلق نظر

دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے کی اور
ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور

اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا
خوف سے آ یہ بھی گہے جو ہاتھ ہے ملا

ایک بلی کچھ گئی تھی آ کے چکھ
یہ لڑی تو منہ پہ پنجہ اپنے رکھ

برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو
آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو

لانگھے ہو جو گھر سے جاتے تند رہوں
چلتے چھینکا ہو کبھو تو کچھ کہوں

تھی جو ظاہر جوں کوا ہی تیرہ رنگ
پر تماشہ کر دی تھے اس کے ڈھنگ

شوق میں ہمسائیاں اس کے رہیں
جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں۔

پھرنے کو تو پھرتی کیا دلی نہ تھی
پر چلے پاؤں کی یہ بلی نہ تھی

رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی
پہر دن پہر دن میں یہ پھر آنے لگی

حاملہ ہو کر کئی بچے دئیے۔
ایک دو بھی سو نہ ان میں سے جئے

متصل ایسا ہوا جو اتفاق
مرگ ان بچوں کی گذری سب پہ شاق

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا
جھاڑے پھونکے کا ہر ایک عازم ہوا

نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈ کر — تیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر

چھیچھڑوں پر بعضوں نے دفنوں لکھے — بعضوں نے تعویز لے کر خوں لکھے!

بی بلاقی سے بہت کی التجا — گربۂ محراب سے چاہی دعا

گوشت کی چیلوں کو پھینکی بوٹیاں — ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں

لڑکیاں بٹھلائیاں کھاٹوں تلے — اس طرح جوں دبکی بلی کم ملے۔

دیتے ٹکڑا منھ کو ہر اک کھولتے — اور بولی بلیوں کی بولتے۔

صدقے اترے چھیچھڑے جو ڈھیر ڈھیر — گربۂ لادہ نے کھائے ہو کے سیر

کیں مناجاتیں دل شب لا تعد — گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد

بوہریرہ کے تئیں مانا بہت — بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت۔

مدح جس بلی کی کرتا تھا عبید[1] — تھی دعا گوئی میں وہ بے مکر و شید

خواجہ عصمت کرتے تھے طاعت جہاں — ایک بلی بیٹھی تھی آ کر وہاں

صبح دم ہوتی وہی گرم سجود — گہہ قیام اس کے تئیں تھا گہہ قعود

چاہی ہمت اس سے اٹھ کر ہر سحر — کچھ تو باطن نے کیا اس کے اثر

پانچ بچے اس نے اس نوبت دیکھے — بارے سب ولے قدرت حق سے جئے

کیوں نہ ایسی ہووے امداد سترگ — بی بلاقی بوہریرہ سب بزرگ

اک توجہ رکھتے تھے ظاہر کی اور — آرزو بر لاتے یہ باطن کی زور

اپنی ماں کے رات دن پینے لگے — پانچوں بچے دودھ کچھ پینے لگے

دودھ کتنا جو کہ بس ہو سب کے تئیں — میں بھی منگواتے لگا کچھ سب کے تئیں

دودھ پی کر کھائے بکری کا چلے — روز و شب لوگوں کی آنکھوں کے تلے

دیر میں میں نے جو یہ ٹک غور کی — بلیاں پانچوں ہیں یہ اک طور کی

دو مہینے تک بہت کی احتیاط — گنتے بلی سب سے موقوف اختلاط!

---

[1] مراد عبید زاکانی جس کی تصنیف اسی قسم کی موجود ہے جس میں بلی اور چوہوں کا ذکر ہے عبید زاکانی ایک ظریف اور ہزل گو شاعر تھا۔

کوئی کتّا آ گیا ایدھر اگر ۔۔۔ لوگ دوڑے شیر سے منھ پھاڑ کر
در سے نکلیں سب ہوئے بازی کے گرم ۔۔۔ زرد زردان کی دُمیں منھ نرم نرم
لچھے ریشم کے سے چیندیں رنگ خال ۔۔۔ کچھ سفید و کچھ سیاہ کچھ زرد و لال
آ نکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار ۔۔۔ وہ طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار
ایک عالم عاشق و بے تاب تھا ۔۔۔ ان کی خاطر بے خور و بے خواب تھا
لے گئے ایک ایک کر سب تین تو ۔۔۔ منّی، مانی، رہ گئیں مجھ پاس دو
منّی کی پھر ایک صاحب نے پسند ۔۔۔ تھی بھی نازک ویسی ہی طالع بلند
مانی کچھ بھاری تھی نکلی بُرد بار ۔۔۔ رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میرے اس کی خواب گاہ ۔۔۔ دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ
میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے ۔۔۔ جان پا دے سُن مری آواز پائے
سب سے آگے آن پہونچے در تلک ۔۔۔ دیکھے میرے پانوں سے لے سر تلک
آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے ۔۔۔ بلّی یا اعجوبۂ آفاق ہے
بلیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں ۔۔۔ یہ تماشہ سا ہے بلّی تو نہیں
گرد رو باندھے تو چہرہ حور کا ۔۔۔ چاندنی میں ہو تو ٹکڑا نور کا
گرم شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق ۔۔۔ بجلی میں اس میں نہ کچھ کر سکیے فرق
یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر ۔۔۔ اٹھتی اُدھر سے نہیں ہرگز نظر
کیسی ہی بلّی ولایت کی ہو زور ۔۔۔ خوب دیکھو تو ہے اس کے صدقے حور
ربط ہے اپنے بھی جی کو اس کے ساتھ ۔۔۔ بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ
ایک دن جا کر کہیں ٹک سو گئی ۔۔۔ مانی مانی سارے گھر میں ہو گیا
بلّی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ ۔۔۔ ہے کبودی چشم یک محبوب یہ
دیکھے جس دم یک ذرا کوئی اس کو گھور ۔۔۔ چشمِ شورِ آفتاب اس دم ہو کور

حسن کیا کیا مانی کے کریے بیاں — ہو جہاں جب تک یہ ہووے درمیاں

خوبی تیتی کی نہ کوئی کہہ سکے — دیکھے اس کو تو نہ اس بن رہ سکے

داغ گلزاری سے اس کے تازہ باغ — اس زمانے تیرہ کی چشم و چراغ

کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس — کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس

یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز — آنکھ دوڑے ہے نہ ہو کیسی ہی چیز

اس کو گر کہیے میں یہ ہو شوخ و چپت — ہے کبوتر مارنا واں کا درست

چوہا چڑیاں ان نے کچھ کھایا نہیں — حج کو جانا اس کے تئیں آیا نہیں

حبِّ مہترہ جو کہ ہے ایمان میں — ہے اسی بلّی کی شاید شان میں

تھا بہت من کا جانا آرزو — سو جنی دو بلّیاں یہ ماہ رو

خال ہے ان پر بھی ماتھے سے عیاں — پر وہ خوبی اور محبوبی کہاں

موہنی اور سوہنی ہے اُن کا نام — پھرتی ہیں چھند ناسی دونوں صبح و شام

نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے — لوگ آنکھوں میں ہی رہتے ہیں کھڑے

حفظ ابھی بلّوں سے ان کا ہے ضرور — رہیوں ان دونوں سے چشمِ شور دور

دیکھے اُن کی اور جو ٹک کر کے چشم — کاڑھ کر دیں بلّیوں کو اس کی چشم

قصہ کوتاہ موہنی آگے موئی — یک قیامت جان پر اس بن ہوئی

صبر بن چارہ نہ تھا آخر کیا — بلّی ماروں میں اسے گڑوا دیا

شاد وہ جس کے رہیں قائم مقام
وائے اس پر جس کسو کا لیں نہ نام

مثنوی در تعریفِ سگ و گربہ کہ در خانۂ فقیر بودند باہم ربطہ داشتند

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی ایک ہے جاں

رنگِ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی انار میرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ
بھوکا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مروت سے جلے کھانا چکھ
لڑے بھی ہے تو منہ پہ پنجہ رکھ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم
موش کی نسل ہو گئی معدوم

چوہا کیا ہے۔ جو سامنے آوے
گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

اُن نے جو ماریاں ہیں گھونسیں دو گھونس
موش دشتی ہوا ہے کونے گھونس

گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو
موش دشتی پہ کیا گذرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے
سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی
اپنے پاؤں اجل اسے لائی

گھونس کیسی بتاؤں غیرت سونس
طاق ہے جس کے آگے طاقت سونس

یا کوئی مادہ خوک آبستن
یا کسو کچھوے کے برادرِ زن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال
پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں ادھر یہ شیر جاتا تھا
پھیرتا منہ پہ پنجے آتا تھا

پڑ گئی اس کی اس پہ چشم کبود
نیلا پیلا ہو تاؤ کھا جوں دود

پنجہ جھنجھلا کے اُن نے گزرانا
بارے کچھ گھونس نے اسے جانا

پر اسے خوفِ جاں نہ آیا کچھ
غالب آیا نہ اس کا سایا کچھ

ٹک ٹھکایا پھر اُن نے جانا تو — کیوں کہ تھا یہ تو شیر کا خالو
پھر تو بگڑی ہے دونوں میں آ کر — چوٹ ہوتی تھی داؤں پا پا کر
غصہ تر موشش کو بھی آن چڑھا — اتفاق اس جگہ تھا ایک گڑھا
دونوں لڑتے ہوئے گرے اس میں — کیچ کاگا ہتے پھرے اس میں
ناخن اس شیر کا پچھ ایک گڑا — شور محشر گڑھے کا بیچ پڑا
شور کیسا مچلے چونک اٹھے — سگ بازاری بھونک بھونک اٹھے
یاں تو گو بیچ کیا ہے پڑی — گھونس بل نے چھیچھڑے کر دی
کوڑے موچھوں کے بال اکھڑاتا — شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا
لیک جی سے تھا سب بدن خالی — کیوں کہ سر سے بلا بڑی ٹالی
گھونس کے وارثوں کی کیا ہے تاب — کہ قدم کو رکھیں وہ حق الباب
کوئی چھچھوندر اب اس پہ روتی ہے — کہ تیری لاش خوار ہوتی ہے
تو جو تھی ساری قوم کی سردار — سو اٹھایا ہے زخم دامن دار
ہم بہت غم میں تیرے روئیں گے — بل کے بل اب خراب ہو دیں گے
فخر ہے اپنی نسل کا یہ شیر — جن نے گھونسوں کے کر دکھائے ڈھیر
سنتا ہے موش گربہ کا قصہ — وہ جو ہے گا عبید کا حصہ
جس کو باندھا عبید زاکانی — لگتی تھی اس کی وہ سگی نانی

گربہ تا بود فاسق و فاجر ق عبید او یک بندے لبا لاتا
ایں زماں پنج پنج می گیرد
کہ شدہ مومن و مسلمانا

در تعریف مادہ سگ

ہے جو وہ مادہ سگ تماشہ ہے ۔۔۔ دوڑ پڑنے کے وقت باشہ ہے
کسی کے لقمے پہ تہ منھ ڈالا ۔۔۔ سگ اصحاب کہف کی خالہ ہے
نہیں کتوں سے خواریاں کہ یہ ۔۔۔ ہے سگوں میں عزیزخاں کے یہ
دے ہرن کو بھی جلدی میں پتا ۔۔۔ ہے گایاں سگ لونار کیا کتا
اڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہے ۔۔۔ استخوان سگ شکاری ہے
یہ جو غصے میں آوے تو ہے غضب ۔۔۔ اس کے مارے ہوئے ہیں ہارے سب
منھ میں دیتے ہیں اس کے جب مشعل ۔۔۔ طرفہ دم لا یہ کرتی ہے اچھل
منھ میں اپنے لئے فتیلے سے ۔۔۔ سگ لیلیٰ کے ہے قبیلے سے
باہم اس کتے بلی کا یہ ربط ۔۔۔ کوئی دیکھے نہ ہوئے اس سے ضبط
کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر ۔۔۔ لگی رہتی ہے اس کی چھت سے نظر
اور سے دشمنی جانی ہے ۔۔۔ اس کی یہ باؤلی دوانی ہے
دونوں شوخی سے مار سہتے ہیں ۔۔۔ سگ و گربا کی چال رہتے ہیں

مثنوی در بیان بز

کہتے ہیں جو غم نداری بز بخر ۔۔۔ سو ہی لی میں ایک بکری ڈھونڈ کر
شعر زورِ طبع سے کہتا ہوں چار ۔۔۔ دزدی بز گیری نہیں اپنا شعار

دزد ہے شایستہ خونریزی کا یاں — بلکہ بابت ہے گُبز آدیزی کا یاں
میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر گہہ — اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ
بکروں کی داڑھی کے تئیں جانے ہیں سب — تکہ ریشی بکری کی ہے بوالعجب
رنگ سر سے پاؤں تک اس کا سیاہ — چکنی ایسی جس پہ ٹھہرے کم نگاہ
چار پستاں اس کے آئے دید میں — دو جہاں ہوتے ہیں دو ہیں بید میں
ایک میں ان میں سے تھا مطلق نہ شیر — ایک کو کہتے ہیں اندھے خرد و پیر
اس پہ کالے بکرے دو خیلا جنے — ناز نخرے سے رہے پھر اٹھنے
چارہ بیٹھے کھاتے اک انداز سے — دیتی پیٹھ تو ہوتے خوش اس ناز سے
دودھ ہو بچھیں تو بچا پئے — بیٹھا دیکھے اس طرف منھ کو کیے
بھوک سے گرم تظلم دے ہوئے — اپنی شایان ترحم دے ہوئے!
دودھ منگوایا گیا بازار سے — پھوہوں سے دینا کیا انفار سے
گھاس دانہ بارے کچھ کھانے لگے — گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے
پرورش سے حق کی بارے جی گئے — آب و دانہ دوڑ کر کھا پی گئے
اب جوانی پر جو ہیں وہ شیر مست — کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہیں چست
مستی اپنی ماں پہ کرتے شاد ہیں — عاقبت بکرے ہی کی اولاد ہیں
زور و قوت سے حریفوں کے ہیں ڈھینگ — آ ہوئے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ
ٹکر ان کی کیا جگر مینڈھا اٹھائے — فوج سرزن سامنے ہرگز نہ آئے
سرزنی میں شہرۂ آفاق ہیں — لوگ بزگردی کے سب مشتاق ہیں
رنگ کو اس جنگ کا کیا ڈھنگ ہے — دیتے ہی میداں کا عرصہ تنگ ہے
ہوتے ہی استادہ طاری ہو غشی — کیا بزکوہی سے ہو میداں کشی
قیس ان کی دھاک سن کر مر گیا — غم گوزنوں کا اتھوں کو چر گیا

گو وہ ٹکڑا کھا جو ڈکراتا رہا — بزدلی سے گرگ بھی چلتا رہا
مارے پانی پانی کر بکرے اصیل — لکھنؤ سے عقل ہے تا بکرے کی جھیل
پاس جانا ان کے اب مسدود ہے — ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے
اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے
کاش کے ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

مثنوی در بیان مرغ بازاں

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
پر و پیر زرا درست یکساں ہے — مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ — قاز و سارس سے جنگ میں کا ننگ
حوصلہ کس قدر ہو اصل کا — ذکر کیا کرگس شتردل کا
لات کی گھات کر جو مڑ جاوے — نسر طائر کا رنگ اڑ جاوے
زہرہ قفنس کا اس خطرے آب — شب نہ سووے ہراس سے سرخاب
بکری سا فیل مرغ کو مارا — کب شتر مرغ سے ہوا چارا
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
سرخ و سبز دار کے سب مرغ — ہیں تماگستر ایسے تھے کب مرغ
ہو جو کہیں مرغ خانگی کے تئیں — مت سن اس ہرزہ چا لگی کے تئیں
لات ماری جو کاٹ کر حلقوم — حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم
کھا کے سینے کے مدعی سووے — نسر واقع کا واقعہ ہووے

نے تنائے بطیں ہی ہیں تر لب — مرغ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب
ٹینی کے تاج سر پہ ٹیکا ہے — اس کے آگے کنیل پھیکا ہے
کیا عجب ان کی رہ گذر کا فرش — ہوں پر افشاں تو ہو فردوس عرش
اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست — کی صدا مرغ دوست نے یا دوست
کیس اس رنگ ہوتے ہیں محسوس — جو گلستاں میں ہو دیں تاج خروس
شور جنگ آوری کا تا کہسار — کبک کا گھر خروس پہ ہے بار
کب ہیں پہلے سے مرغ زریں بال — حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال
کر سکے وصف مرغ کیا کوئی — مرغ آسین کو دعا گوئی
وقر اتنا کہ دیر بیچے لیں — جان دے کوئی تخم مرغ نہ دیں
مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا — در الطاف باز کر دیکھا
ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ — ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ
مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز — مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز
یعنی اپنا حریف جب پاوے — پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے
سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال — جیسے چشم خروس آنکھیں لال
بازی بد بد کے جب لڑاتے ہیں — کانٹے لوہے کے باندھواتے ہیں
آیا حلقوم کے کر حلق کے پار — پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار
ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ — پانی کرنے لگا تر آکر وہ
کچھ جو ٹھہرا تو دم دیا ان نے — تعبیہ کر کے رکھ لیا ان نے
اور جو سست ہو ہوا ڈھیلا — دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا
دم سے کیا ہو یہ بے دم و مجروح — قصد پرواز میں تھا مرغ روح!
ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور — ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور

پھیلا پاتی ہیں وہ غم جاں سوز — دل زدہ پھر رہیں مرغ دست آموز

جانور رنگ باختہ سب ہیں — یعنی حیران فاختہ سب ہیں

مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے — بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اڑ کر کہیں چلا جاتا — دیر اپنے مقام پر آتا

جیسے منگار کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — ان نے کی لوک یہ کڑکنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

مرغ کی ایک پر فشانی ہے — ان کی صد رنگ بد زبانی ہے

ایک بولے کر کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ

جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ایک کے منھ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار

منھ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعد نصف النہار رخصت ہے

کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ — لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

پھر جو روز شین آوے گا — نالہ مرغ سحر سناوے گا

عالم آوے گا گرد ویسا ہی — گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی

میر ان کا نہ ہووے جو قائل
مرغِ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مثنوی در ہجو خانۂ خود

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ — کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم — تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام — چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریے — راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے
جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ — ہے چکش سے تمام ایواں کیچ
آنکھیں بھر لاکے یہ کہیں ہیں سب — کیوں کہ پردار ہے گا یارب اب
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات — گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات!
باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر — اُن پہ رڈّا رکھے کوئی کیونکر
کیچ دے کے جوں توں چھوپا ہے — چھوپا کاہے کو بلکہ تھوپا ہے
قس کو پھر پرچھتی بھی ہئی نہیں — ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو — یا ہمارے لئے بچھا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہو خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھر کا!

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے — کہیں جھینگر کے بد مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے — جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ادھر ادھر سے — لاکے یارب بناؤں کس گھر سے
چارپائی جب اس میں بچھوائی — پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے دوائے خراج — ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے — ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان — وہی اس تنگ خلق کا ہے دکان
کڑی تختے سبھی اس دھوئیں سے سیاہ — اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے — کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے — کوئی دا سا کہیں سے چھوٹا ہے!
دبکے مرنا ہمیشہ مد نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم — تھے جو شہتیر جوں کمان ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
پڑے اس ملیفہ میں کرختی ہے — تختے تختا ہوئے یہ سختی ہے
ہوئیں اڑ داڑیں پھر جو حد سے زیاد — چل ستوں سے مکاں دلے ہے یاد
اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر
جیتے ہیں جب تلک نہیں پہونچے — ورنہ کیا بس ہے جو نہیں پہونچے
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال — پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا مینا تو ایک بابت ہے — پودنا پھدکے تو قیامت ہے
کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار — تھرتھرا دے بھنبھیری سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا   شاق گذرے ہے کیا کہوں کیسا
ہو کے مضطرب لگے ہیں سب کہنے   آڑ بھنبھیری کے ساون آیا اب
تیتری یاں جو کوئی آتی ہے   جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے
نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ   کہیں کھسکی تو ہے قیامت ننگ
ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا   بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا
چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور   کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور
ہونا ایسا کہ اپنی چپال چلے   دوڑے اُچھلے کہ ہاں ہاں چلے
نہیں وہ زاغ چار پانوں پھرا   ایک کالا پہاڑ آن گرا
مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی   جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی
ساں کر خاک لگ گئے دو چار   بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے   بر سے ہے اک خرابی گھر در سے
اکھڑے بکھرے کواڑ ٹوٹی و مہد   زلفے زنجیر ایک کہنہ حدید
خاک لوہے کو جیسے کھا دے پاک   چھیڑ لیجئے تو پھر نری ہے خاک
بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں   قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور   ہے خرابی سے شہر میں مشہور
جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب   ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک چھپر ہے شہرہ دلّی کا   جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے   سو وے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے
گل کے بند صن ہوئے ہیں ڈھیلے سب   پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
مینھ میں کیوں نہ بھیگے یکسر   پھونس تو بھی نہیں ہے چھپر پر
مٹی ہو کر گرا ہے سب والا   وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا ‏ ‏ یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد ‏ ‏ مگری اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا ‏ ‏ کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لا لا
ٹپکے دو چار جا تو بند کروں ‏ ‏ پیچ کوئی لڑاؤں فند کروں
یاں تو چھانکے ہزار میں تنہا ‏ ‏ کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا
بس کے بدرنگ ٹپکے ہے پانی ‏ ‏ کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں ‏ ‏ کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں
مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا ‏ ‏ آسماں جو پھٹے تو کیا چارا
بان بھیگ کر تمام چاٹ گئے ‏ ‏ بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے
تنکے جاندار ہیں جو بیش و کم ‏ ‏ تن پہ چیونٹیوں کو جنگ ہے باہم
ایک کھانچے ہے چونچ سے کر زور ‏ ‏ ایک مگری پہ کر رہی ہے شور
پوچھ مت زندگانی کیسی ہے ‏ ‏ ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے
کیا کہوں جو جفا کشی سے سہی ‏ ‏ چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی
بوریا پھیلا کر بچھا نہ کبھو ‏ ‏ کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو
ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی در ایسا ‏ ‏ چھپر اس چونچلے کا گھر ایسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ ‏ ‏ پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی ‏ ‏ چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں ‏ ‏ سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے ‏ ‏ سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر ‏ ‏ ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا ‏ ‏ پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں — ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیئے پہ گہہ بچھونے پر — کبھو چادر کے کونے کونے پہ
سل سلایا جو پائنتی کے اور — وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
تو شک ان رگڑوں میں سب پھاٹی — ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان — ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی نادان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو — پائے پٹی لگائیے کرنے کو
جب نہ تب پنڈے پر لیے پائے — سیتلا کے سے دانے مرجھائے
سو یہ تنہا نہ پان میں کھٹمل — آنکھ منھ ناک کان میں کھٹمل
کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی — آنکھ سے تا پگاہ خواب گئی
ایک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں — سینکڑوں ایک چارپائی میں
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیئے — کب تلک یوں ٹٹولتے رہیئے
یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار — اس میں سی سالہ وہ گری دیوار
آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ — تھے جو ہمسائے دلے ہیں ہمخانہ
ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے — جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ — کاشش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں — ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز — کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
وہ جو ایوان تھا حجرے کے آگے — اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
کو تھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جز جز میں اس کے بیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا — ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا ‏ ‏ کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر ‏ ‏ خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا ‏ ‏ پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھائے ‏ ‏ یا ملک آسمان سے آئے

مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں ‏ ‏ کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی ‏ ‏ ہم جو مردے تھے جان سی پائی

آنکھ کھولی ادھر ادھر دیکھا ‏ ‏ اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرت حق دکھائی دی آ کر ‏ ‏ یعنی نکلا درست وہ گوہر

داشت کی کوٹھری میں لا رکھا ‏ ‏ گھر کا غم طاق پر اٹھا رکھا

مومیائی کھلائی کچھ ہلدی ‏ ‏ فرصت اس کو خدا نے دی جلدی

غم ہوا اس کے دوستداروں کو ‏ ‏ پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رہے ‏ ‏ گو تصرّف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جا بہم نہ پہونچی کہیں۔ ‏ ‏ چار ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ ‏ ‏ اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس ‏ ‏ خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس

قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں ‏ ‏ رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ سببِ شدّتِ باراں خراب شدہ بود

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
غلطیاں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھو سارے پرنالے — اس کے معمار نے ادھر ڈھالے
اب جو آیا ہے موسم برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے، — کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے
مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر — ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے — سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند — کہ جنھوں نے کئے ہیں جھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
اڑ گئی گھاس مٹی ہے والا — ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا
اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے — ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو — باندھتا ہوں بچان رہنے کو!
بند جھانکوں کو کیجیے تا کے — یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے
ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم — سر پہ تھٹڑے لیے کھڑے ہیں ہم

تتیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہے ایسی زندگانی میں

اب تو اپنا بھی حال ہے بدتر
سر پہ گٹھری ہے تس پہ ہے چھپّر

پانی بہہ کر جھکا جو ہے دالان
سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے
گریۂ زار سوگواراں ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

واسے پایان کار لوٹ گئے
طاقچے پھر رہے تھے پھوٹ گئے

بہہ گئے گولے تختے ڈوب گئے
غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں پیٹھی
جان غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھری تھی حباب پانی کا

یوں دھنسا گھر کہ بار خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

آ کھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا
وہی چھپّر کھڑا ہے گھر بیٹھا

جب اجارے پہ آ کے چھت ٹھہری
ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب
ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سن کے ہر اک کے جی میں در آیا
خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی
سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا | اس کا سارا فگار سکا ندھا تھا
ساتھ کوئی چراغ لے نکلا | کوئی سر پر اجاغ لے نکلا
چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا | مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا
منھ پہ چھلنے کو ایک نے اوپا | ایک نے سرکی سکا کیا گھوپا
ایک نے چھینکے حال حال لئے | پائے پٹی گلے میں ڈال لیئے
ایک نے بوریا لپیٹ لیا | اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا
اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر | الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر
صف کی صف نکلی اس خرابی سے | تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے
میر جی اس طرح سے آتے ہیں | جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں
جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا | ہنس کے بے اختیار وہ بولا
سن کے اس بات کو نہ رائے ہم | بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم
تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب | نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش ایک نفس معاش کریں
طور پہ اپنے بود و باش کریں

مثنوی در مذمّت برشگال باراں دراں سال بسیار شدہ بود

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات / جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند ٹھمتی نہیں ہے اب کی سال / چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے / آسماں چشم وا کو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں / تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب میں کوئی بولتا ہی نہیں / آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو / ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب / چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے / موش دشتی کے خار سبز ہوئے

ابر کس کس سیاہ مستی سے / ہوتے جا ہیں بلند و پستی سے

لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے / خاک بازی اب آب بازی ہے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی / پانی پانی رہے ہے بارانی

تنگ آبی سے جان مست اغراق / ڈوبنے پر ہے کشتیِ آفاق

عقل مینہوں نے سب کی کھوئی ہے / بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفان مینہ چھایا ہے / زخم دل نے بھی آب اٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام و در / یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماج بوند پیکاں ہے / مینہ ہے یا کہ تیر باراں ہے

جیسے دریا ابلتے دیکھے ہیں — یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

ابرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے — ایک عالم غریقِ رحمت ہے

لے گئے ہیں جہاں کو سیلاب — نقشۂ عالم کا نقش تھا بر آب

نہ ہے جلسہ نہ ربط یاراں ہے — شہر میں ہے تو بادِ باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ چمکا ہے — ان دنوں رنگ برق پہ چمکا ہے

بڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریئے — سنگِ باراں جہاں ہو واں مریئے

پڑھتے ہیں یار درسِ حیرانی — آرسی کے بھی گھر میں ہے پانی

آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں — مردمِ آبی پھرتے چلتے ہیں

گتے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب — سگِ آبی ہی ہیں جہاں ہیں اب

وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار — کوچے موجوں کے ہو گئے بازار

معبد اب سارے گرتے آتے ہیں — زاہدِ خشک ڈوبے جاتے ہیں

تھا ٹھہرنا برابر ان کے شاق — مسجدوں میں کیا ہے استغراق

مینہ تو یاں اب لگے ہی رہتے ہیں — سارے عالم کے کان بہتے ہیں

غرق ہے چڑیا اور گلہری ہے — خشکی کا جانور بھی بحری ہے

مینہ از بس کہ بہہ بہا ہے گا — اک جہاں کو ڈبو رہا ہے گا

شعر کی بحر میں بھی ہے پانی — بہتی پھرتی ہے اب غزل خوانی

لائی یاں زندگی کی چالاکی — آب خشک گہر پہ نمنا کی

ہے زراعت جو پانی نے ماری — ہو گئی آ نجست ترکاری

آب ہے گا جہاں کے سر تا سر — خوف سے سوکھتا ہے میوۂ تر

مست ہو ہو گئے ہیں مستِ شراب — غوطے کھاتے پھرے ہیں عالمِ آب

مستی ہے اب جو چاہیں سیرابی — ربط ہے تو ہو گی ہے مرغابی

دستِ غم اس قدر بہ طغیاں ہے — کہ ہر اک گوشہ میں طوفاں ہے
سیل دیکھے ہے کوہ ساراں کی — لئے کشتی گرا ہے بار ان کی
جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے — جو ہے تا لابِ قہر دریا ہے!
ہر طرف سے ہے نظر میں ابر سیاہ — پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ
سیلہا در رکاب دیدۂ ماست — چشم تا کار می کند دریاست
پانی کا عالم کہ تا بسر ہے گا — خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا
خضر کیوں کر کہ زیست کرتا ہے — آب حیواں میں پانی مرتا ہے

لکھے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

مثنوی در ہجو نا اہل مسمّی بہ زبان زد عالم

شنیو اے اہل سخن بعد از سلام — چھیڑتا ہے مجھکو اک تخم حرام
پر نہیں مرتی کا گرم طیر ہے — وہم میں شہباز کا ہم سیر ہے
کام مجھکو کچھ نہیں ہے اور سے — بلکہ اس با بھی طرز سے اس طور سے
شاعری کو میری ہو گے جانتے — تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں با وقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا
کیا ہوا گر چاند پہ پھینکے ہیں خاک — پڑتی ہے ان سب کے منھ پر میں ہوں پاک
رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ — مدعی بے ہیچ ہے یہ رو سیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — دردمند و عاشق و دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ

ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے — مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا — اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیوان کی میرے نقل کی — اس دوانے کی کنھوں نے نقل کی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید — کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی بیٹھے کہہ گو نہ جانے میری قدر — پائیں ہے پائین آخر صدر صدر

بیکسی تخصیص خدا کی اور سے — ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

ایک اچھا دے جو اک عمدہ کو جوگ — تو اسے کیا کچھ طرف جائیں گے لوگ

جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے — ایسے لچے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بیست سال — گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال

کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف — ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اک نومشق تھے گرم سخن — سو بچارے آپ ہی ناآگاہ فن

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سالہ سا بے نور تر

کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود — قلیۂ وہ روز سے بھی بدنمود

آنے اچھا ہے جو اس کو روک دو — ورنہ منھ دیکھو تو دو ہیں اک دو

باپ اس کا سخت ناداں نادرست — کوڑی کی سی گندی بلی قاق و سست

ایک جا آیا شتر قد گھر گیا — واں شتر غمزہ سا مجھ سے کر گیا

رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ — یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

اس تحمل پر نہ کی مطلق نظر   خار پہلو کا ہوا ہر جا لچر

جب لگا ہے ناچنے مستی سے خوب   تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب

مستی اس کی ساری اب جھڑ جائیگی   دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائیگی

جب بڑوں سے مارنا ہموار کھائیں   کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے   اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز   اس کی خلقت کہے کیا اے بے نیاز

ہیئت اس کی مضحکہ ہے سوانگ ہے   جید عوج بن عنق کی ٹانگ ہے

سر کے تئیں اس کے جو دیکھوں کر نگاہ   بانس پر ایک اوندھی ہانڈی ہے سیاہ

تیرہ رو مضحک سراپا زور ہے   دُم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے

شکل وصورت دیکھ کر حیراں رہوں   یکساں سب مل کے لگ لگ ہی کہوں

بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا لو تیار   آتے جاتے جا دیں اس کو جوتے مار

چال جب چلنے لگے سر جھاڑ کر   پانوں کو پہلے رکھے منہ پھاڑ کر

بال و پر رکھتا نہیں ہے پاؤ سر   ورنہ تھا یہ بھی عجائب جانور

ایک دن بیٹھے تھے یاں ذات شریف   وارد اس دن ہو گئے کتنے ظریف

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو   یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو

یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں   سر کہیں ہے پانوں اس کے ہیں کہیں

ایک کے آیا مکوڑا وہم میں   ایک کے مور سواری فہم میں

ایک نے ہنس کر دیا اس کو ڈھکیل   اور بولا اے تری قدرت کے کھیل

کیسا اعجوبہ یہ پہونچا ہے یاں   چونچ ہو تو ہے شتر مرغ کلاں

ایک بولا کر کے چشمک میری اور   واہ صاحب جانور پالا ہے زور

ایک دن باہر تو ہولے کر کڑے   یہ اچنبھے یوں نہیں رہتے پڑے

جائے اُس وحشی کا شک و سواس بھی — چوک بھی ہے پاس یہ نسناس بھی
اس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا — لیک یہ خرزنا مشخص ہی رہا
یہ جو ہے موشک دوان و شور چشم — موش پشتی چہرہ و شب کور چشم
بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا — مستحقِ لعنتِ عالم ہوا
چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا — پاس کب تک کیجیے نام و ننگ کا
یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا — یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا
نافصاحت فہم کو دعویٰ بڑا — ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا
ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے
جنگ ہاتھی کی ہو گو اس کو ہوس — پر اسے ہے موت کا ریلا ہی بس
ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی — پودنے کی سی ہے اس کی ضامتی
میں تے پاس اس کا کیا حد سے زیاد — پر کمی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد
قبلہ کہتے کہتے حاجی ہو گیا — پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا
رشکِ شہرت سے مری مرنے لگا — میری عزت کا حسد کرنے لگا
لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے — یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے
یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن — دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن
ایک ہی دو ہوتے ہیں خوش طرز و طور — اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے زور
خفتی وہ کریئے کہ ہو معقول خلق — نے انھوں سے جو کہ ہو مقبول خلق
دشمنی تھی اس کو مجھ سے کیا ضرور — حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور
ہوں جو میں پرتو فگن تو ہے یہ کیا — خور کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا
خونِ دل آشام ہیں جو صبح و شام — دے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام
یہ مری آرہ کا نہ حائل ہو سکے — یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

میں نے اُلٹی اجگروں کی دم میں صف
ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ ناسید کہے ہے کیا چمار

ہجو کی جو اُن نے میں کیا دب گیا
بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا

ننگ ہے میری توجہ اس طرف
حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف

دارد دستک سے ہے اس کے مجھ کو شرم
تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم

اُن عزیزوں کا نہایت پاس ہے
ورنہ یہ ملعون کیا کناس ہے

جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس
کاٹوں کا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم
تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز بوم

ایک بد بختی رہا ہے گی بوم میں
لطف وہ پاتے ہیں ہم اس شوم میں

دیدنی ہے قدرتِ ربِّ ودود
ایسی اچرج کم رہا ہوتی ہے نمود

کیا کمی ہے یہ جو عزت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدہ آدم کرے

کرتی ہے تعظیم میری کائنات
لعنت اس پر ہوتی ہے دن اور رات

یہ بلا ہے یہ کسیج ..... گزک
میرے دنکارے گئے چھچھوڑے دبک

میری ہیبت سے نکل جاتا ہے موت
دشمنی کی ان نے اپنی ما . . .

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
اُلّو ہے اور اُلّو کی مادہ بھی ہے

عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور
ہے کسو حافظ کا نطفہ یا چہ خر

پر وہ حافظ جو ہو قرآں خوانِ قبر
اس سے لیں کار تلاوت گو یہ جبر

چھٹ گیا ہووے دماغ اس کا تمام
پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح و شام

وہ حرف جو ردے سے جا ایک جا ہوا
ایسا اُلّو سا خدا پیدا ہوا

دیکھ کر آن کے خرامی ہائے سرد
ایک کوّے نے کی تقلید تدرو

گود کر چلنے لگا آخر کو راہ
اپنی بھی رفتار بھولا روسیاہ

کاش کہ ہو دیں محذر شیخ و شاب
چھوٹے سے منھ جو پکاسے کیا جواب

گو کہ یہ پچھن کرے کیا مال ہے
آگے میرے ... کا سا بال ہے

چاہوں گا جب پھینک ہی دوں گا اکھاڑ
ایسی ... سینکڑوں ڈالی ہیں جھاڑ؟

بدنمائی اس کی ہے بے ساختہ
کیا ہے یاں ملیش بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ
کیا بلا ہے مادہ خوک حاملہ

گرگ گردن خوک چشم و غوک سر
غول صحرائی کا بچہ ہے مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فن مشکل کا ماہر ہو گیا

باپ کو ان نے بنا رکھا ہے اوت
ہیں کہاں ایسے سعادت مند پوت

کم ہوا ہے گا جو اس کا زور پا
جانتا ہے اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سر کار
تب تو ٹھہرایا ہے اس کو راز دار

اس نہ تازا دے نے جو لب وا کیا
پہلے ماں کا راز ہی رسوا کیا

ایک ہی شب کے تئیں جلوا دیے
یار ماں کے باپ کو دکھلا دیے

پھر حقیقی باپ سے جا کر ملا
اس مجازی کا کیا اس سے گلا

پیسے اُس کے کھا کے جب کنا ہوا
یاں کسی تقریب آ پیدا ہوا

تب سے روز و شب اسی کے ساتھ ہے
اس حرف کی داڑھی اس کے ہاتھ ہے

بس قلم تعریف ہے میری بس اسے
ہے دماغ بحث پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں پواج

مثنوی مسمیٰ بہ تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف — کسب کرتے جن کی تھیں طبعیں لطیف

تھے تمیز درمیاں انصاف تھا — خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو — کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

تھے جو اس ایام میں استاد فن — ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں — کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کارخانے میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو

چار و ناچار اس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال — دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخش شمع — واں کی دینداری رکھو اور دل کو جمع

جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں — تو یقیں ایمان کیا دیں کہاں

ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم — یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انھیں استاد فن — ان کے ہوتے رہبر راہ سخن

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں نداّفوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا — جو کوئی آیا اسے دی پاس جا

کچھ نہ استعداد سے کی گفتگو — کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ
پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ
کرنے لاگے شاعری سے حرف گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال
ذہن ان کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی
اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید
سب تے جانا اس کو شاگرد رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن
آگے استادوں کے ہو گرم سخن

ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبان فن کے منھ چڑھنے لگا

نیم قد اٹھ اٹھ کے یہ سننے لگے
جا د بیجا سر کے تیئں دھننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہہ وقت کار
ہم سے تم کو کرنے لاگا اعتذار

سر پہ رکھ کر دعوی طبع لطیف
میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

جب تلک یاں تھی تمیز زشت و نیک
کاہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہل فن کی رہتی تھی سب کو تلاش
اُن کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش

جو کہ خود سر رکھے استادوں سے عار
اُن کے تیئں ہر گز نہ ہوتا اعتبار

زندگی بلکہ انھوں پر شاق تھی
ہاتھ گر لگ جاتے تھے شلاق تھی

مثنوی اژدر نامہ

یہ موذی کوئی نا خیر دار فن
نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن

نہیں جانتی ہوں میں مار سیاہ
زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ

نفس ہے مرا افعی پیچ دار
گیا جس سے حضم قوی من کو مار

جدھر بھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ　　دم دم کشی لب پہ کھیلیں ہیں ناگ

جہاں میں ہوں وہ جا ہے پر شر و شور　　عصا سے چلے راہ چلے راہ واں مار مور

مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا　　جلا آگے میرے کبھو کب دیا

سُن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا　　کہاں کیچوے یہ کہاں اژدہا!

نہ خصمی مری اژدروں سے ہوئی　　طرف مجھ سے ہو جونک کیا اودہ موئی

اگر شورِ زاغاں سے ڈر جائے مار　　تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار

کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی　　کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ　　دبے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ

جہاں شور اژدر سے ہے دھوم دھام　　کوئی کنسلائی سے نکلے ہے کام!

بظاہر یہ لائے تو ہیں پر نکال　　دبے ہوں گے ان کے جیوں کے دیال

حریفی انھوں سے ہو اژدر کی کب　　وہ کھینچے جو یک دم تو بھنکاریں سب

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میرؔ　　سرِ راہ کہتا تھا جو اک فقیر

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم　　درندوں کے بھی دل تھے اس سے دو نیم

نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر　　پلنگ و نمر واں نہ رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب　　شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک　　دم اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک

نکلتا تھا جب بہر برگ و نوا　　شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا

کہاں سایہ اس جا و سبزہ کہاں　　درخت اس کے جاتے رہے تھے نہ واں

صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند　　جگر چاک کرتے ہوا سے پرند

درندوں کے برجا نہ رہتے حواس　　چرندے مکانوں سے ہوتے اداس

وحوش اس بیاباں میں جلتے نہ تھے　　طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے

کبھو اس کی رہ میں جو اٹھتا غبار — تو وہ دشت تھا ایک تا ایک غار

پہونچتا تھا گردوں تلک شور و شر — ہوا صاف ہوتی نہ دو دوپہر

رہا کرتی کوسوں تلک اس کی دھوم — نہ اس راہ آتا کوئی جز سموم

ہوئے ساکنان بیاباں پتنگ — اٹھے کوہ و وادی سے شیر و پلنگ

گئے جان لے لے وحوش و طیور — کوئی رہ گیا موش و مینڈھک سا دور

گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی — کسو اور جنگل میں بھوکی ہوئی

گلی میں جو یاں کے کھلے اس کے لب — ہوئی واں کی اعیان گرم غضب

خرِ طلبن و خرموش و موش و شغال — اس اژدر کو کر جنس اپنی خیال

رواں ساتھ اس کے شبانہ ہوئے — کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے

رعونت سے مینڈھک اچھلتے چلے — بلوں میں سے چوہے نکلتے چلے

قریب اس بیاباں کے جس دم گئے — انھوں میں سے آگے بہت کم گئے

قضارا وہ آفت تھی سرگرم سیر — چلے آتے تھے بھاگتے جن و طیر

لگا ڈرنے خرموش سا پہلواں — ہوا مضطرب کیچوا سا جواں

وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی — ہوئی خوف سے اس پہ طاری غشی

قدم غوک سے گرنہ کا جل گیا — بھروسا تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا

جہاں پہلواں موش در ستم عاش — لگا کرنے میداں میں بل تلاش

کہ سوراخ پاوے تو روپوش ہو — یہ تشویش یک دم فراموش ہو

ولے چھوڑتا کب ہے خصم قوی — کہ ہو خوف جاں سے کوئی منزوی

پراگندگی تھی اس انبوہ میں — کہ گرگ تھی بلائے سیہ کوہ میں

اس آواز سے جی نکل ہی گئے — جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے

سیہ جب ہوا ہو گئے منھ سفید — ہوئے مدعی جان سے ناامید

پھر ایک دم ان نے وا کرو ہاں — کہ پایا اس انبوہ کو نیم جاں

دم دیگراں سے نہ کوئی رہا — وہی دشت خالی وہی اژدہا

زمانہ وہی آگ کا چار اور — ہوا گرم ویسی ہی ویسا ہی شور

وہی دم کشی شام سے تا سحر — اسی ہولناکی سے وہ دشت و در

گئی یہ خبر جس بیاباں میں — رہی سُدھ نہ کچھ واں کے سکان میں

کنھوں نے کبھی منہ نہ ایدھر کیا — نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا

مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ — طرف ہوں مری ان کی طاقت ہے یہ

جو مجھ کو ہو کچھ بھی انھوں کا خیال — تو یہ مار گیری کریں کیا مجال

تو کیا ہو انھوں سے بہت دور میں — ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر — گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

مثنوی در مذمت آئینہ دار

آج ہے مجکو نہیں رنج و ملال — جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب — مدعی شعر ہیں حجام اب

ان سے لیکن اک مو برابر بھی نہیں — جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں

پر ہوئے سر چڑھ کے یہ موئے دماغ — دور ہو جانے لگے سوئے دماغ

ہو گئے گرم سخن تب تو قلم — ورنہ یوں بے ہودہ کب نکلا ہے دم

ایسے مونڈے ہیں نے کتنے بے شعور — ہے حجامت اس بھی فرقہ کی ضرور

یاں نہ سمجھ کچھ ہے نے نائی بے شرط ہے کسو کسوت میں دانائی بے شرط
سنگ کو نجم الدنیا کے سرداری ہوئی نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی
میر و مرزا میں حکم ہو وے خود نے کی نائی جن پہ سب کا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر نے وہ رگ زن جو سمجھے سیر شیر
مجھ میں مرزائی تفاوت ہے بہت یاں تأنی واں عجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں ہوتے اس جاگہہ جو مرزا بیگماں
اُسترے کانوں میں اپنے باندھ کر کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر
ان کمینوں کا گلہ کیا کیجیے ایسے دس پیدا ہوں گر نہ لیجیے
کہتے ہیں سرگرم بے باکی ہے یہ ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ
لکھیے اس فرقہ کے اب تا چند دم خط بنا دیں ایسا کہیے کف قلم
گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار لیک ان کا منھ نہ دیکھیں کاش یار
صاف قینچی پر انھیں چڑھوائیے گر نمو ہو اس میں پھر ہو جائیے
چاہو ہو اس قوم کی شرح حال آگے ہی آویں گے جتنے ہوں گے بال
اک سفید ان کو نہیں چننے کی تک ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک
کیا کہوں کیسے ہیں اندھے یہ لچر کیجیے اصلاح جائے ہووے شر
کھو چلیں ایسا سر کر دیں پائمال سیدھیاں جب سن لیں تب لیں الٹے بال
معتبر ان کے جو حجامی ہیں اب ہند میں وہ تیرہ روشنائی ہیں اب
کوئی لے جاوے جو حاجت غسل کی چلو چلو پانی پر دیتے ہیں جی
معتنیں کرتے ہی گذرے اس کو واں غسل میں فرصت تشہد کی کہاں
بیٹھے حمام خانے میں کیا غسل کر جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر
لیک پھر اجرت کے اوپر جنگ ہے لات ہے گالی ہے پھر سر جنگ ہے

اس سقا دے میں گیا تھا اک حریف — اس کی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف
دھو کے پاجامہ نہانے بھی گیا — یک طرف پھر پائے تھانہ بھی گیا
غسل کے پیچھے جو منھ گھر کو کیا — ہاتھ نائی کے پیسا سوا پیسا دیا
نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا — دمڑی بہ کیسی ہے میں قرباں گیا
ہنس کے بولے تو نہ بدلے جائیو — یاں ہوگا بھی ہے اُسے اٹھوائیو
چوہڑے نائی ہیں سارے ایک ذات — ان میں ہے بدذات جو ہو نیک ذات
آیا اک نائی زنانہ سا نظر — ہاتھ میں نلوا لیے بے پاؤں سر
میں کہا آتا ہے نلوا کام کیا — بولتا ہے آگے سے بار نام کیا
..... اس میں لو ٹیوں کی ڈال کر — مونڈتے ہیں ..... اک اک بال کر
ہاتھ میں رکھیے تو ..... ہو اکھیں — ضبط کی شائد نہ طاقت ہو اکھیں
غدر اگرچہ واں تلک بھی یاں نہیں — لیک اک دن اس میں اپنی جا نہیں
دھکے چڑھ جاویں نہ جانے کیسے کے — جب بھی جاوے واسطے دو پیسے کے
سن کے اس سے ایسی اچرج بات کو — میں کہا لعنت تری اوقات کو
کاشتے ان کے تئیں مشکل گذر — پنڈے کے لٹکے ہیں پاچہ خر
بعضے بعضے ان میں سے جراح ہیں — بحر خوں و ریم کے ملاح ہیں
زرد و زنگاری کو ہی ڈیلے ساتھ — حیض کے سے ایک دو لیتے ہیں ہاتھ
موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں — پھر مسیحائی کا دم اس پر بھریں
پھیر پگڑی بیٹھیں ایسی شان سے — آئے ہیں گویا ابھی ایران سے
باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں — داغ کو اس کے جراحت کر دکھائیں
بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر — سو مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر
رنڈی گت ناچے یہ اس کا منھ دکھائیں — پاپیا مشعل لیے مجلس میں جائیں

روشنی لے دوڑتے ہیں وقت شام　　گھورتے ہیں کر کے اندھیارا مدام
تیل کی کپی لے خوش ہیں کھڑے　　ایک بھر دے ہوتے ہیں چکنے گھڑے
لگ چلیں تو ہینگے جیسے موچنے　　کھائیں تب جب سر میں لگیں تب سوچنے
چھیڑیو تو مغز بھی لے جائیں گے　　سر کے تیلی سہلا کے بھیجا کھائیں گے

بے حقیقت ہیں نہیں شایان کار
صحبت ان سے بگڑی ہے پایان کار

شکار نامۂ اول

چلا آصف الدولہ بہر شکار　　نہادِ بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی موج دریا کے رنگ　　لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانوں سے جانے لگے　　وحوش اپنی جائیں چھپانے لگے
شنِ آواز شیرانِ نر ڈر گئے　　پلنگ و نمر خوف سے مر گئے
جہاں ببر آیا نظر صید تھا　　بیاباں اسی پھن سے قید تھا
گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ　　دیئے پنجۂ شیر نیلوں سے توڑ
نہ دیکھا نہ ہم نے سنا یہ شکار　　کہ بکری سے ہاتھی کو لیتے ہیں مار
پلنگان صحرا کے دل خوں کئے　　نہنگان دریا ہوئے مرجیئے
کہاں سہل مارے گئے نرہ شیر　　لگے بکریوں کو پکڑتے بھی دیر
ہوئے لشکری جبکہ سرگرم گشت　　مقید ہوئے مست فیلان دشت
گئے جانور دشت خالی رہے　　بیابان جھاڑے گئے تو کھے

عجب تر ہے یہ صید کرنے کا ڈھنگ | کہ چو رنگ ہاتھی ہوئے بید رنگ
نہ چلتل نہ پاڑھا نہ ارنا نہ شیر | ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر
درندوں کا پیدا نہ نام و نشان | نہ شیر ژیاں و نہ پیل دماں
کبھو شبل دشتی نہ جکڑے گئے | نہ یوں بھیڑ بکری سے پکڑے گئے
سنا جس طرف فیل دشتی کا میل | رواں فوج ادھر کو ہوئی سیل سیل
اگر ٹک بھی اٹکا تو مارا گیا | پڑے سیکڑوں پھاند چارا گیا
دگر سرکشی سے کی آستادگی | تو پیش آئی اک طرفہ افتادگی
پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا | بزور آمد و شد کا حائل ہوا
جُھٹے دونوں ڈیلے دیو میدان میں | اُٹھا شور محشر بیابان میں
جہاں دونوں فیلوں کی تھی سرزمیں | شتر مرغ سے واں نہ ہو پر زنی
جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا | کئی روز رسوں سے جکڑا رہا
رہے کس طرح پھٹ گیا تھا جگر | ہوا دو پہر میں لہو موت کر
مگر سرکشی سے نہ اپنی ہٹا | نہ میدان میں ٹک دبا ٹک گھٹا
اشارہ ہوا اس کے چو رنگ کا | سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا
برسنے لگا مینھ تیروں کا زور | ہوا فیل یاراں کا جنگل میں شور
لگی پڑنے بجلی سی تیغ سیاہ | پریشان ہو جیسے ابر سیاہ
نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت | گرا یوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت
رکھا لا کے لشکر میں اثنائے راہ | سر اس کا کٹا جیسے برج سیاہ
رہے کہتے اس دن عجب سب ہے یہ | سر فیل ہے یا سر شب ہے یہ
اگر دیو ہیں سرگرانی کے ساتھ | نہ اس تیرگی بھی و کلانی کے ساتھ
دماں خشمگیں جیسے آتش یہ تھا | مگر فیل سر دیو سرکش یہ تھا

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجیے شرح
گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

گیا دشت در دشت شورِ شکار
ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن جھکلیوں میں رہے گھومتے
چھپے نیل سبیلوں میں ہی جھومتے

برابر رہے گور و شیرِ ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواسِ جاں

گئے پیشتر چھوڑ کے چیر گہہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

اس اوقات سے جو کہ بے ہوش تھے
بہیر و بنہ جا گہہ خرگوش تھے

اگر ریچھ نکلا تو تھا سو بسو
بہت مضطرب تھا وہ آشفتہ مو

قلندر سیاہی پے جاں ہوئے
لیے اس کو سر در گریباں ہوئے

علف آب گوں تیغ کا پھر ہوا
کہیں پاؤں اس کے کہیں سر ہوا

موئے اس طرح حضرت بوحمید
کہ جوں ہوتے ہیں گے بڑے سے پلید

گرے پشت سوئے فلک خاک پر
اک انبوہ تھا جسم ناپاک پر

گئے لادنے فیل پر لشکری
یہی ذات تھی لائق برتری

کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں
کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں

پڑے سینکڑوں دام تالاب میں
نہ چھوٹی تنک خاک اس آب میں

نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ
نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ

رہے گوشت ہی پکتے ہر صبح و شام
جواں کھا گئے مرغ و ماہی تمام

ہوا حائلِ راہ بحرِ عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

قریب آکے اتری یہ خائف تھی فوج
کہ بے ڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج

مہیب اور آلودۂ خاکِ آب
بعینہ پھوٹی آنکھ، تھا ہر حباب

غضب لجہ خیزی بلا جوش پر
تلاطم قیامت لئے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے
مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے

تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار — کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ — کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ
لگے پانوں چلنے جہاں شور تھا — کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا
تامل سے اقبال نواب دیکھ — توقف کیا پہلے تو آب دیکھ
پھر اس پار جاکر اشارہ کیا — کہ لشکر نے وو ہیں گزارہ کیا
شتابی اترنے لگے لشکری — نہ جوش آب کا وہ نہ ویسی تری
وہ سوتا جگاتا تھا جس کا خطر — اٹھا شور سے فوج کے چونک کر
نشہ اس کے سر سے اتر سا گیا — چڑھائی کے لشکر سے ڈر سا گیا
کچھ اک ناویں لے کچھ شجر کاٹ کر — شتابی سے دریا کے تئیں پاٹ کر
اترنے لگا لشکر بیکراں — کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں
سلامت ہوا پار سب اژدہام — رہے دنگ خضر علیہ السلام
شکار اس کنارے بھی تھا بیشتر — ہوئے صیدیاں کے جگر ریش تر
گئے ارنے مارے سو مانند فیل — ہوا خون جنگل میں ان کا سبیل
رہے گوراتوں کے تئیں جاگتے — گئے ببر کو سونا تلک بھاگتے
پکڑ لائے چیتے گوزن اور گور — عصلتے راہ یاں مار و مور
بہت ہم نے دیکھے وزیر و شہاں — شکار ایسے دستور سے تھا کہاں
نمک خوار مجھ سے تو ہیں گے ہزار — یہ میر ابھی ہونا ہے یاں یادگار
غرض میر تا دور چرخ بلند — رہے آصف الدولہ اقبال مند
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام — شکار اس کے دشمن رہیں صبح و شام
غزل میر کوئی کہا چاہیئے — ٹک اس بھی زمیں پر رہا چاہیئے

بازقدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ بہادر روزِ دیگر برائے شکار

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار — اسد باد کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال — نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال
گیا شورِ تا آسمانِ بریں — ہوئی گرد افواج گردوں قریں
زمیں ہوگئی جائے خوف و خطر — فلک کو لگے دیکھنے شیرِ نر
چڑھا سب کہ دریائے فوج گراں — اتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں
دبی چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال — پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار سے راہ لی — نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بچے جو تھے دام سے چھا گئے — کشف کے نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے چھپے — گزندوں کے منھ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں — گوزن اور گورا اور آہو کہاں
رہے گور یک شاخ یک سو غزال — تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال
شغال اور روباہ و خرگوش سے — نہیں بحث کچھ یہ ہیں بے ہوش سے
کوئی شور سن سن کے گھبرائے ہے — کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے!
کوئی ڈھونڈتا ہے بیاباں میں جھاڑ — کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ ادھر نہ ہو کل مشکل — کوئی دن جیے اس بلا سے نکل
پھرے مضطرب ہو کے شیرِ غریں — کہ بیشوں میں تھے یا کماں یا کمیں

نکلتا ہے گفتار پر بے حواس　　ہنر بر جگر خوار سب ہیں اوداس

کیا کام ڈرتے گئے پھٹ جگر　　بن آئی ہی مر مر رہیں ہیں نمر

اگر خرس تھا مفتر و بدمعاش　　لگا موش جانے کی کرنے تلاش

وگر ببر ہے پیش و پس ہے نگاہ　　نہیں سوجھتی بے حواسی سے راہ

مبادا شکاری سگانِ رکاب　　گریں آکے مجھ تک بھی پہونچیں شتاب

ہوا آب زہرہ وہ شیرنی کی گئی　　جگر ڈر سے ہے خوں دلیری گئی

ہوئی میدہ بندری کی جنگل میں دھوم　　گرے نیاں جیسے گھٹا آوے جھوم

بیاباں میں چھایا ہے کیا ابر سترگ　　برستی ہے گولی بسانِ تگرگ

لڑائی نہیں ہوں جو مصروف جنگ　　اڑیں رنجکیں اڑتے دشمن کے رنگ

جو آتا ہے پلٹن کو کچھ ولولہ　　چلے ہے کوئی توپ ہے زلزلہ

اگر جائے تھی اس کی کوہِ گراں　　گیا شیر جھنکے بھی جا کہے یاں

نہ دل مرد ہے ببر و گرم شتاب　　دلِ شیر برفی بھی ڈر سے ہے آب

نہ رنجک کے اڑنے کا اچھا ہے ڈر　　ہوا آن ہی میں زمانہ کچھ اور

ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا　　رکھا آب میں جا کے لک لک نے پا

محیط آب گیروں کے تھے مردکار　　ہوئے مالک الحزن چندیں ہزار

بہت دام پانی کی جانب جھکے　　کھڑے رہ گئے رود کیا کیا سکے

ٹھٹھک سونس گھڑیال رہ رہ گئے　　مگر مچھ نہ جانے کدھر بہہ گئے

نہ قشقل نہ بسلی نہ سرخاب ہے　　تمام ان کے لہو سے سرخ آب ہے

عجب روغنِ قاز ملتے تھے یار　　کہ قازوں کو لیتے ہوائیں سے مار

منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف　　سو وہ چربی اب پھینک دیں ہیں حریف

ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار　　نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار

مگر مرگ ماہی تھی جالوں کے بیچ — کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں الیچ
نہ ارنب ہے جنگل میں نے سوسمار — کوئی بارہ وی کیا کھا دے پروردگار
کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف — ہوئے بیچ میں قرقرے بھی تلف
نہ جب سے گئے سبزہ کھا کھا کے چیت — بنزے ویسے ہی آئے کھیتوں میں کھیت
بٹیر اور تیتر کا ہے کیا شمار — کہ باز آ گئے جس سے کرتے شکار
ہوا زرد سبزک بہت دل میں ڈر — نمو مو ہوا گرد سے شانہ سر
خطرناک تھا دشت کیا کہیے مور — ذبایوں پھرے جیسے دبتا ہے چور
نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی — بنوں میں جو وو تھی گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پر ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

نشیب و فراز بیاباں کو سُن — جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن
چڑھو آسماں پر جو آوے چڑھاؤ — پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ
جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر — کہ در پیش ہے اور عالم کی سیر
زمیں فیق از بس ہوئی یک بیک — نہ پھیلا سکا پانوں گز پا تنک
ملے پرے پر تھے ہوا میں کلنگ — کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ
قیامت تھی آفت تھی ہر ایک چوٹ — لگے جس کے پھر تھا وہیں لوٹ پوٹ
ہوئے خون اُس جمع کے بیدرنگ — ہوا کا ہوا اور اک دم میں رنگ
نہ پر تھا نہ پر زا نہ بازو نہ پا — کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا

نہ زردی کو دیکھا نہ پایا کبود | نکالا ہے لوگوں نے پانی سے دود
سپہ کی بلا ترک تازی رہی | نہ سارس کی وہ سرفرازی رہی
کماندار مردم سے چارہ گیا | کسو کھیت پر مفت مارا گیا
نہ جو فیل دشتی کی مستی گئی | وہیں مٹ گیا اس کی ہستی گئی
سناتوں کی لوکوں پہ پھر بٹ گیا | وہ کوہِ گراں سنگ سب چھٹ گیا
بہت جانور چھوڑ آخر گئے | لگی دَ دوں بہت جل گئے مر گئے
اگر بن ہے گویا بنا ہے آے | کرے قصد واں کا تو کیونکر گھسے
مگر زور سے کچھ نکلتا ہے کام | بہت رنج کھینچے سے چلتا ہے کام
خریدار دستار سر خار بن | زمیں پر رکھو پانوں کانٹوں کو چن
کئی گام یوں راہ چلنا پڑے | پھر اس واگہہ سے نکلنا پڑے
تو آگے بیابان پُر خار ہے | کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے
اگر اس میں پانی نظر پڑ گیا | کنارہ پہ اس کے یہ چڑھ کر گیا
ہوا حال اپنا پریشاں بہت | پھرے مضطرب اور حیراں بہت
ترائی جو واں سے گذرنا ہوا | کہاروں کے سر چڑھ اترنا ہوا
بیابان وحشت اثر پُر خطر | یہی ڈر رہے ڈر گیا ادھر کیا ادھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس | اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل تڑپ کے بند ہو جائے دم | لکھوں کیا نیستاں ہی تھے یک قلم
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آب رواں | کوئی شیر غراں کہ پیل زماں
سو وہ شیر مارا گیا مغلِ سنگ | وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تازہ ڈنگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار | ہوا دلکش و جرگہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب | تو ہم بھی رکھ لیتے بے شک و ریب

سطح زمیں میاں دریمیل تھی — نہ دریا چہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
اگر آگیا رود خانہ کہیں — نہ دل خواہ تھا واں سے جانا کہیں
بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں — نہ تھی وحشت زرجیف اس دشت میں
ہوا ایک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہ گراں — کہ صد چشم کا اس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند — ہوا پر پچھی اس کی نزدی پرند
پھر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے جیسے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب
نہ پوچھو اور اسباب مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قنات اور تنبو بسر سب گئے — کھڑے تھے جو کندے اتر سب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا تھیلہ ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایکبار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار
بھرے باد سے لوگ منہ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر فگار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہہ تیغ خورشید پنہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا
بہت اسپ و اشتر موئے پانوں پیٹ — نکالا انھیں خیمہ گہہ سے گھسیٹ

کسو بن میں ارنوں کا پاکر نشاں — لگی جانے ہر صبح فوج گراں
مقابل ہوا آکے جو فیل مست — اگر فیل تھا تو ہوا اس کا پست

غضب ہے خدا کا کوئی اس کے چوٹ — اگر اسپ اشتر ہے تو لوٹ پوٹ
نہ خوک اس کی جنگل میں گھیرے ہے راہ — نہ شیر اس کی جانب کرے ہے نگاہ
بڑی دیر جنگل میں دوڑا پھرا — لیا زیرِ بندوق آخر گرا
لگی بہنے شمشیر جدول شعار — لگے قیمہ کرنے جوانانِ کار
بہت ایسے مارے بہت کٹ گئے — نظر کر کے ہیئت جگر پھٹ گئے
کسو بن میں رونق نہ پائی گئی — پھر اس پر جو ایسی ادائی گئی
جگر واں کے شیروں کے پھٹ پھٹ گئے — بیاباں سے کرگدن ہٹ گئے
نہ فیلوں میں سدھ بدھ نہ شیروں میں زور — نہ چیتوں کو جاگہہ نہ گوروں کو گور
نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ — پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اکھاڑ
پرندہ جہاں پر نہ سکتا تھا مار — ہوا رہ کلے توپ کا واں گذار
نکل شیر جنگل سے حیراں ہوئے — اڑا ہے جو تھے صاف میداں ہوئے
جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار و مور — چلے پھروں واں تیر بندوق زور
شغال اور خرگوش و ہم روبہاں — شکاری سگوں نے کئے نوش جاں
ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں — گرے سیکڑوں ایک آواز میں
بہت جانور کھا گئے کر کباب — ہوئے مرغ آشیانے ہزاروں خراب
جو اصلی تھا کیا جو کہوں تھا کہیں — کہ تعداد کشتوں کی پاتے نہیں
بہت مضطرب جھلکیوں ٹنا پھرے — سلامت نہ آخر گئے بر سرے
انھوں ہی میں سیمرغ بھی تھا مگر — کہ پر مارتا ہی نہیں کوہ پر
نہیں فیل مرغ اور شتر مرغ اب — کہ بعضوں کے طعموں کے کام آئے سب
کسو بن میں تھے نیستاں اور کانس — چلے راہ واں سے نہ سکتے تھے سانس
برس میعد دو دن میں کھل بھی گیا — ولیکن ہے گہرا لطیفہ نیا۔

کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود
ہوئے ہونٹ سردی سے سب کے کبود

ہوا سرد ہو کر گئی جان مار
اٹھایا بڑا لطف سرد شکار

دل اس دود تیرہ سے گھبرا گیا
کہیں آگ دیکھی تو جی آ گیا

یہی چال تھی ایک دو چار کوس
ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اوس

کسو کوہ کے پاس نکلی جو راہ
گئی کوہ کی تیغ تک کم نگاہ!

بلندی تھی اس کوہ کی تا فلک
نگہ جاتے ہی جا کے جاتی تھی تھک

نہ اس رنگ سے سیہ ہوں گے کہیں
ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں

جہاں دام اور دد کی تھی بود و باش
لگے چوک لوگوں نے کی واں معاش

ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر

تراکم قیامت تھا اشجار کا
ستم پھیر ہوائے ستمگار کا

کہ اس مرتبہ بار و د سرد تھی
ہوئے شکن مگر برف پر درد تھی

کوئی خار بن حایل رہ ہوا
پھٹے پیرہن ہوش سب تہ ہوا

درختان بے برگ و بر بد نما
نہ اک شاخ پر مرغ رنگیں نوا

بہت سر ملائے بہم تھے شجر
و لیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر

نہ قمری ہوئی نالہ پرواز تک
نہ بلبل کی واں آئی آواز تک

یہی کل مکل تھی یہی کشمکش
پھرے مارتے سر کو دیوانہ وش

درختوں کے انبوہ سے رک گئے
چلے اتنے جھک کے کہ ہم جھک گئے

اگر شاخ جا گہ سے اپنی ہلی
تو کانٹے سی ہم رہرواں پر چلی

جو اس دشت میں تھا کوئی صید بھی
سو آگے ہی وہ ہو گیا قید بھی

رہائی ہی مفقود تھی واں سے یار
پڑی اپنی سب کو کہاں کا شکار

کہوں کیا یکسر تھے اس میں قلم
چلے رو سیہ اور سو سو بہم

نہ چھوٹی تھی جا گہہ قدم دار بھی — نہ اٹھتا تھا اک نالۂ زار بھی
کہ دل کو کسی کے لگے جوں خدنگ — ہوئے ایسے سنسان جنگل میں تنگ
نکلتا ہوا کھینچ کر یہ عذاب — ملا بیشتر ایک تہہ دار آب
رواں تھا کسو کی طرف تند و تیز — ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز
حباب اس کا چشمک زناں موج پر — کہ یوں گرم جاتے ہیں اہل نظر
طلبگار کرتے نہیں سادگی — نہ ہو جوں گہر ایسی استادگی
کنارے پہ اس کے اترنا ہوا — زد بالا ہوئی ٹھنڈ مرنا ہوا
نہ رکھتے تھے جوں رند مفلس لباس — نہ ان سے ہوا اپنے جامہ کا پاس
غزل کہنے کی یہ بھی جا خوب ہے — جو اچھی ہو موزوں تو کیا خوب ہے

پڑے کتنے زوروں میں بانک و پٹے — جواں اس سے آگے بھی جا کر ڈٹے
نہنگ اس طرف کے بجا رو کے سن — پلنگ ان بنوں سے چلے سر کو دھن
غریب اشتلم جنگلوں میں رہا — نہ جھانکا ادھر کوہ سے اژدہا
گیا سیکڑوں کوس شور شکار — رہے ٹھور حیوان یک جا ہزار
چلا باز چھاتی کو کھولے جہاں — پرندہ رہا وہم کا بے گماں
زمیں گرد جرہ ہے کیا تیز بال — رکھا جنّے اٹھتے ہی مرغ خیال
فلک سیر شاہیں کی پرواز دیکھ — لگے جوں نگہہ جا کے انداز دیکھ
نہ جھاڑا گیا نسر طائر سے سر — گھٹا کرگس چرخ چھوٹا نہ پر
رواں جس گھڑی ہوتی فوج گراں — بھیر دنبہ ہر طرف سے عیاں
زمیں پر قدم کوئی کیونکر دھرے — بیاباں فراخی سے تنگی کرے
کوئی شعبہ آیا اگر درمیاں — ہوا شور لشکر سے محشر عیاں

بلندی و پستی تھی اتنی کڈھب کہ گاہے زمیں گہہ فلک پر تھے سب
کوئی نالہ کھولا اگر آ گیا تو اپنا کیا پھر کوئی پا گیا
گرے یاں رہے یاں یہی چال تھی جہاں در جہاں خلق پامال تھی
ہوا دن تو یوں کھینچتے رنج شام گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام
کہے ہے کوئی کون آتا ہے یہ پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ
لگے آنکھ کیڑوں سے تئیں زور ہو پھر آرام سے رات کو سو رہو
ہوا خیمہ گہہ دامن کوہ سب رہا آکے نواب واں تین شب
قریب ایک مٹیا پہاڑی تھی واں لگا اس سے کم کم تھا آب رواں
پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا کہ انبار تھا خار و خاشاک کا
محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت
ہوا بد بہت اور پانی لگے قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے
چلے باؤ تو ایک موحش ہے شور رکے پانوں دامن کو کھینچے بزور
فقط خار بن کیا کیٹر پھاڑ تھا کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا
چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں
نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں مگر پچھلے پانوں ہی رہ رہ ہٹیں
کہیں ہاتھی آیا ہے بھڑکا ہے اونٹ کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ
کہیں ہیں لگے انفار سرگرم جنگ کرے ٹٹو پر تل کا عرصہ ہے تنگ
قیامت نمودار ہر ہر قدم چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم
کہیں بچ کے نکلے کہیں جھک چلے کہیں مضطرب تھے کہیں رک چلے
اسی طور منزل کو کر قطع راہ پہو نچتے رہے ہم بحال تباہ
شجر جمع تھے کچھ تہہ کوہ بھی فرود آیا اس جا یہ انبوہ بھی

زمیں اونچی نیچی خشونت بہت — اسی سے تھی واں کم سکونت بہت

ولیکن وہی خاک زشت و پلشت — ہوئی بود آدم سے رشک بہشت

ہوئی بیلچوں سے برابر زمیں — چمن سے بھی شاداب وہ سرزمیں

وہ پانی جو چلتا نہ تھا ڈھنگ سے — کہ تھا راہ گھرا سرزناں سنگ سے

صفا اور خوبی میں کچھ بڑھ گیا — کئی ہاتھ مقدار سے بڑھ گیا

غزل اس زمیں پر بھی کہتا ہے میر — دل اپنا ہے لطف سخن کا اسیر

پہاڑی سے لشکر چلا سوئے کوہ — چلے بس تو کر لیے سیہ روئے کوہ

پڑی تھی وادی سوختہ بیچ میں — کہیں آب میں تھے کہیں کیچ میں

نیستاں سے ہے خرابہ کڈھنگ — بٹیلے سے عرصہ نہایت ہے تنگ

شجر جنگل ایسے تھے انبوہ سے — کہ ان میں سے جانا ہو اندوہ سے

کہیں بید کے برگ خنجر گزار — کہیں پا نہ رکھنے دیں سر تیز خار

تنک دو درختوں کے ادھر ہوئے — نیستاں پھرتے ہی پھرتے ہوئے

اگر بید آئے تو بن بید باف — نہ آئے نظر دور تک راہ صاف

اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت — کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

ہمیں چار نالے اترنے پڑے — کنارے پہ دو دو گھڑی تھے کھڑے

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر — چلے دو قدم راہ پائی کر اگر

بہت لوگ دشت قلم کو گئے — بہت اسپ و اشتر عدم کو گئے

لگے ہاتھ فیلان دشتی کی راہ — دلے ڈر نہ ہو فیل کوئی سیاہ

نہ ہاتھی ملا کوئی بارے نہ شیر — ہوئی خیر کو طے ہوئی راہ دیر

تعجب سر کشیدہ بہت کیا کہوں — جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

چناراں درختوں کے تھے پائمال　　سفیدار رکھتے تھے حسکم نہال
اگر کوئی دریاچہ آتا ہے بیچ　　تو لوگوں کے روندنے ہوتا ہے کیچ
تل کوہ رفعت نمودار ہو　　گیا آمد و شد میں ہموار ہو
کوئی گل زمیں آئے ایسی نظر　　کہ عالم نے ادھر لگائی نظر
کہیں سبزۂ تر سے جی جا لگے　　کہیں سرسوں پھولنے دلوں کو ٹھگے
نہ تھا پر گل زرد دامان کوہ　　یہی رنگ تھا تا گریبان کوہ
فضا دلکشا آب یکسر صفا　　شجر خوش نما نرم نرمک ہوا
چکارے بہت مارے کہسار میں　　دو دستہ بکا گوشت بازار میں
یہ انبار اشجار تا سشتش کردہ　　پھر آگے بیاباں وہ ہے اور کوہ
کناروں میں اس کے کہیں کوئی کھیت　　دگر نہ یہی سنگ بے رتبہ ریت
نہ سبزہ کہیں تھا نہ آب رواں　　نہ دامن میں اس کے چکارا دواں
دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال　　سیاہی پکڑتے تھے چشم غزال
وہی جنگلہ دو طرف بد نمود　　مقام اس طرح کے بھی ہیں یاد بود
نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار　　نہ ظاہر میں اس کے کہیں لالہ زار
نہ چشمک زناں دور نزدیک پھول　　نہ نرمی سے آتی تھی باد قبول
چلے باد ایسے کہ جھکڑ رہے　　ہوا اور پانی میں جھگڑے رہے
ادھر باد کا شور ادھر آب کا　　شب و روز مذکور کیا خواب کا
ادھر کے تئیں ایک تھا آبشار　　وہ البتہ شایان سیر و شکار
وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاؤ　　اڑانے نہ دے جو حواسوں کا باؤ
سوا اپنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ　　کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ
بہت شعبۂ کوہ مشہور تھا　　زبانوں پہ لوگوں کے مذکور تھا

قدم رکھ جو نواب وہاں تک گیا — سر اس شعبہ کا آسماں تک گیا

کڈھب نہ جگہ سیر گہہ ہو گئی — حضور اس کے فردوس تہ ہو گئی

ہوا خیمہ استادہ ایسی جگہ — کہ آنے لگی دیر واں سے نگہہ

رواں دو طرف اس کے ایک آب کم — کہ دل کا لیے جائے سب زنگ غم

جہاں تک نظر کیجیے مار نظر — ہوا موج زن کوہ کے تا کمر

نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے — گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے

وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا — رواں گرم تر سوئے صحرا ہوا

بہا دامنِ کوہ میں سنگ پر — کیا سنگریزوں کو بھی رنگ پر

کہ لوگ ان کو ہاتھوں میں رکھنے لگے — جواہر کے رنگوں پر کھنے لگے

کراڑوں کا کیا عظم کیجیے بیاں — برابر کھڑے تھے دو کوہ گراں

انھیں میں سے تھی راہ آس آب کی — وہیں بھیڑ رہتی تھی احباب کی!

ہوئے دامن کوہ میں کچھ مقام — سفر کی بھی مدت ہو شاید تمام

کوئی روز گھاٹی کی بھی سیر ہے — سبھوں کی ہے معلوم پھر خیر ہے

جو اتنی میں کسو سیر کا دیں نشاں — نظر آئے یا کوئی پیل دماں

تو اور ایک دو دن کی ہو لگے ہے دیر — وہ ہاتھی بندھے کھیچے گا یا وہ شیر!

شکار ایسا دیکھا ہے اس بار کا — کہ جھاڑا ہوا دشت و کہسار کا

کوئی دیکھے کب تک پہاڑ اور جھاڑ — ٹلے چھاتی پر سے کہیں یہ پہاڑ

غرض ہے وزیر جہاں ارجمند — زمیں کلاں کار عالم پسند

در اس کا ہے باب سجود سراں — رہیں حکم کش اس کے زور آوراں

سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

بہانے نہ کر میر اب شاخ شاخ — غزل کہہ زمیں گو کہ ہے سنگلاخ

شکار نامۂ دوم

مکرر ہے نواب کو قصدِ صید ——— بیاباں پہ تھا اور اب ہوں گے قید

رواں بحرِ لشکر ہوا موج موج ——— گئی چشم خورشید تک گرد فوج

بحار و صحاری پہ ہے عرصہ تنگ ——— مگر یاں سراسیمہ ہیں واں پلنگ

پہن بیٹھے ہیں شیر پیری لباس ——— کریں لوگ شاید فقیری کا پاس

چکاریں ہرن دونوں اندیشہ مند ——— دلوں میں ہراس کمان و کمند

کہیں گرگ وادی کو فکرِ گریز ——— نظر آید صرا ادھر کب خیر تیز

بنوں میں ہے آشوب کوہوں میں ڈر ——— بیاباں وطن سارے گرم سفر

کہیں امن ہو تو کہوں واں گئے ——— نکل آگھروں سے پریشاں گئے

اسد کی نہ شیرانہ ہنکار ہے ——— نہ گفتار کو تاب رفتار ہے

جہاں کے تہاں نکرمیں ہیں کھڑے ——— کہ دنگل ہے جنگل میں کیا بن پڑے

ہوا دود باروت سے تیرہ رنگ ——— صدائے تفنگ و صدائے تفنگ

ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے ——— ہوا ہی میں یہ پچھی پکھیرو جلے

گئے باوجود آسماں میں پلٹ ——— کلنگوں کی صف باز نے دی الٹ!

اُٹے ہاتھ دو چار جرے کہاں ——— رہے مرغ آبی جہاں کے تہاں

پرِ تیر جس دم کشادہ ہوئے ——— بُزے صید حد سے زیادہ ہوئے

بنوں میں بھی دھوم کی آگے دھوم ——— جہاں دیکھیے ہے قیامت ہجوم

کہیں اسنے مارے غضنفر کہیں — کہیں ہاتھ نکلا ہے اژدر کہیں
پڑے مست ہاتھی جو تھے من چلے — سُن اس شور کو چھوڑ بن کو چلے
نہ تیرہ ہے روز گوزناں وگور — کہ شیروں کو بھی قشعریرہ ہے زور
لب آب جاکر جو کھیلے شکار — اسد واں کے تھے گودکے سوار
ہوئے قرقرے صید ہو ہو کے ڈھیر — ہوائیں سے بھاگا عقاب دلیر
زغن ان بنوں میں نہ پائی گئی — نہ تندار کی لاش اٹھائی گئی
ہوا ہے یہی تو یہ ہوتی نہیں — کہ ہو قاز آکر سیہ یاں کہیں
جگر کیا کہ پر زن ہوا اس بن میں زاغ — یہ زہرہ نہیں رکھتے کو ہی کلاغ
شتر مرغ بیمرغ از بس ہراس — نہیں آتے کوہ شمال کے پاس
غزل کہہ کہ ہے میر لطف ہوا — بیابان خوش آئندہ و خوش فضا

اٹھا فوج میں سے یہ گرد و غبار — کہ منہ پر تھا خورشید آئینہ دار
فلک کہرے سے تھا دھواں سا نمود — سماں شب کا رکھتا تھا ملک شہود
زمیں تھی سو کھتی فرش بالائے آب — تحمل سے مطلق نہ رکھتی تھی تاب
نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا — جو رکھے قدم واں تو بھونچال تھا
روندے لگے چلنے تیزی سے چال — ہوا مذہب شیعیان اعتزال
کسی ڈھب سے جوں توں کہ چلنا ہوا — عجب مہلکے سے نکلنا ہوا
اُتر لوگ دریا سے آگے گئے — ہنر برانِ خونخوار بھاگے گئے
پلنگانِ مردم دراسے ڈرے — کہ جاتے ہیں کو ہولکے چھوڑے درے
بیاباں میں مرنا کہاں سر دھریں — نہ لیں راہ بڑ عرب کیا کریں

غزل میر یاں کہ اگر ہو دماغ
تو کے دل ہمارے بھی ہوں باغ باغ

بنوں میں پھرا کرتے تھے ہم تو دیر — نہیں بولتے ڈر سے عزنده شیر
رہے تھے جو فیلانِ مست آن کر — گئے کجلی بن یاں سے ڈر مان کر
جوان میں سے آکر لڑا پھر دیا — سو کٹھ بندنوں سے ہوا فیل پا
گریوے کہیں تھے بلند اور پست — پھر آڑتے تھے واں جیسے پیلانِ مست
بہی تیغ نواب اس طور سے — بہے جدول تیز جس طور سے
بہت رہ گئے زیر شمشیر و تیر — بہت آئے لشکر میں ہو کر اسیر
لدے ہاتھیوں پر جو ہو کر شکار — ہوئیں بوجھ سے پشت فیلاں فگار
کئے گم جو گینڈے نے اپنے حواس — کھڑا ہو رہا آ کے بھینسوں کے پاس
کہ بھینس اس کو بھی جان کر لشکری — چلے جا لگیں صرصر نمط سرسری
نہ چھوڑا ہے طیر ایک عصفور تک — نہ وحشی کہیں اور لنگور تک
لگے جا کے شاہین و دستور یوں — پڑے بکریوں میں کہن گرگ جیوں
کلنگ ایسے بازوں سے آئے ستوه — کہ کابل سے آگے گئے صد کروه
غضب کر گئے جرے نواب کے — اڑا کھا گئے خیل سرخاب کے
نہ لگ لگ نہ تیتر رہا دشت میں — نہ تمخوارک آیا نظر گشت میں
سبھوں میں جو تھے قاز و سارس سرا — ہوئے صیدیوں جن پہ آیا ترس
حواصل کو ہوتا اگر حوصلہ — تو گرتا نہ کھیتوں میں ہو وہ دلہ
کہیں سارے طاؤس مرتے گئے — ادھر لوگ افسوس کرتے گئے
کہیں جی اٹھی تھی نہیں بعد مرگ — نہال اس کے خوش قد بسیار برگ
نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے — نظر جائے جس جا تلک سبز تھے

ہوا دل کش و ہر طرف سبزہ زار — کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار
کھڑے لوگ محوِ تماشہ تھے واں — کہ کہنے لگی بلبلِ خوش زباں
کہ خاطر جنوں سے نہ رکھتے تھے چنت — خبر بھی ہے تم کو کہ آئی بسنت
یہ عہدِ جنوں ہے جنوں کیجیے — جگر کو غزل کہتے خوں کیجیے

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا — کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا
نظر گرد لشکر پہ تھی دم بدم — نہ تھا واں کے ضیغم کو کچھ اور غم
کوئی ارسلاں بھیجتا گر رسول — تو شاید کہ الحاح ہوتی قبول
سوئے خوں گرفتہ تو بھولے ہوئے — بہت اپنے زوروں پہ پھولے ہوئے
چلے ہر طرف آپ جو آکر تفنگ — نہ اوقات صلح و نہ ہنگام جنگ
لگی آگ جنگل میں چارا گیا — بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا
ہوا چہرہ کوئی تو جوں شیر سنگ — نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ
لگی گولی پڑنے نہ پھر چل سکا — نہ جاگہ سے اکسا نہ ٹک ہل سکا
چلے ہم جو بہرائچ سے پیشتر — ہوئے صید دریا کے واں بیشتر
بھرے فرط ہی سے تو دیہات شہر — کہے تو کہ سوتے رہے دو دو پہر
گھٹے گولیوں سے مگر بے شمار — رہے سونس گھڑیال چندیں ہزار
جو کچھ زخم پانی میں لے کر گئے — وہیں ہو کے ناسور مر مر گئے
لگا کہنے باخہ سر اپنا جھٹکا — کہ پانی تو جالوں سے سارا اٹکا
اگر جائیے تہہ کو دھنس جائیے — دگر کاٹرے سر تو پھنس جائیے
عجب مخمصہ ہے بچے کیوں کہ جان — یہی موت ہے سوجھتی ہے ندان
جواب اس کا گھڑیال نے یوں دیا — گھڑی ایک دو کا ہے قصہ رہا

پڑی سر پہ بجتی ہے فرصت نہیں — پھر اس کو کھینچے ہیں اب کیا کہیں
تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہو — کریں کیا اگر یوں ہی تقدیر ہو
کوئی دشت یک دست نے راز تھا — رکھے واں قدم پانوں افگار تھا
یہی سینک یا کانس پانی کی گھاس — زمین و ہوا آب و آتش اداس
نہ پتا نہ شاخیں نہ سمجھو اُن کو بار — سراپا ہے خشک و زبوں زرد و زار
نہ سائے سے ان کے کوئی بہرہ مند — نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند
سیاہی نہ ہرنوں کی ڈار و دنے کی — نہ چشمک کہیں سے چکاروں نے کی
کہیں لپٹے آپس میں دو چار نے — کہیں ہاتھی آیا کہیں شیر نے
کہیں سر پٹا سر پہ تھا جیسے تیغ — درندوں کے پانوں پہ آیا دریغ
نہ بلبل غزل خواں نہ طیروں کا شور — سبھی دیکھتے تیر کے منہ کی اور
سو اُن نے غزل ست سہی یہ کہی — ولے دل کو لوگوں کے لگتی رہی

چلے صبح گہہ دامنِ کوہ کو — تماشا کناں فوج و انبوہ کو
درختوں میں چلنا تو دشوار تھا — ولے راستہ بھی قدم وار تھا
گزارا ہوا یوں ہی اک آدھ کوس — پٹیلے پہ ہنگام آرا تھی اوس
نیستاں میں چھپتا تھا گھوڑے سوار — اگر ہو تو واں شیر کا ہو شکار
نہ رہتے تھے سو شیر شرزہ بھی واں — نہ ہاتھی کے پانوں کے پایا نشاں
پٹیلے سے کیلے کا جنگل ملا — پھر آ کر وہیں یہ جو دنگل ملا
عجب کشمکش درمیاں آ گئی — پھر اک بلا تھی جہاں آ گئی
نہ ہلنے کی جاگہ نہ چلنے کی راہ — سروں پر کھڑے اسپ فیل سیاہ
خطر فیل دشتی کا ہر ہر قدم — گئے شیر کے ہر قدم پر قدم

کنار آب کے لوگ اترے تمام ہوئے دامن کوہ میں کچھ مقام
سر کوہ کیونکر نہ ہو چرخ سائے کہ نواب واں سیر کرنے کو جائے
رہے آب پہ فرش بچھ کی و تخت نچے رود کوہ و زہے ان کے تحت
ہمارا تو جانے کو چاہا نہ جی کہ تھے پیر ہم واں ہوا خوب تھی
رہی منعقد بزم تھا ناچ راگ نہ ہو کچھ تو کیونکر ہو یہ دل کی لاگ
کہی اور ہی بحر میں یہ غزل مگر میر کو ہے دماغی خلل

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب کہ قدر اُن کی جوں قدر یاقوت ناب
لیے عمر ہاتھوں میں دیکھی بہار کہ ہر شئے کا ہے وقت لیل و نہار
اسی آب کا راجی یاں ہے نام ہمیں ساتھ اُس کے ہے ربط تمام
کنارے کنارے اسی کے ہے راہ چلے جاتے ہیں جو نہ ہووے پناہ
جہاں تک ہے آب و خوراب جائیگے تمہیں دیکھیں گے جو نظر آئیں گے
جبل سے ہوئے ظاہر آثار آب برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب
ہمیں پر نہیں کچھ ہوا کیا ستم کہیں گرگ وادی کو بھی ہے یہ غم
کہیں ایسے سکڑے ہیں حیوان دشت کہ ٹکڑے کرو تو نہ ہو گرم گشت
نہ نکلے ہے ہاتھی نہ بولے ہے شیر کوئی یوز پکڑا ہے سو بعد دیر
نہ پوچھو کھنچا دور کار شکار نہ اب دشت و در میں نمر ہے نہ مار
شکار افگناں راہ کرتے تھے طے ملے جاتے تھے خاک میں دشت نے
نہ ببروں کو جنگل میں طاقت رہی نہ مگروں کو پانی میں فرصت رہی
اسد مارے جاتے تھے سگ کی مثال بندھے آتے تھے یوز و گرگ و شغال
ملا ایک جھکڑ اگر یا گھٹا تو کثرت سے تو نیزہ پانی چڑھا

بہت مشکلوں سے کیا ہے عبور   کہ یک گام راہ اور سو سو فتور
غزل بحر کامل میں تہہ دار کہہ   کہ اُتر جائے میر اس بحیرے کی تہہ

پڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے   بندھے پائے فیلاں سے رسوا ہوئے
بہت نلے کھولے پکھالے گئے   بحیروں سے رد ہو نکالے گئے
مگر کی پس از مرگ عزت ہوئی   کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی رخصت ہوئی
کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب   کہ جھینگوں نے کی شرح کشاف اب
نہ تیتر بٹیر اور کبوتر ملا   دیے بازجروں کو سارے کھلا
کہیں بحری پانی میں یوں جل گئے   کہ پنجوں میں بے صید ادھر آگئے
ہوا میں سے یوں گر اتارے کلنگ   کہ بازوں نے چڑیا سے مارے کلنگ
کسو اور ارنوں کو دیکھا کڑے   کہے تو بیاباں میں ہاتھی پڑے
جگر کر کے جاتے تھے مردان کار   تو وہ ایک دو کر ہی لاتے شکار
دگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا   قریب اس کے جانا بہت دور تھا
نہ ان چار شانوں کا روکش ہے شیر   نہ سو فیل دو چار رکھتے ہیں گھیر
مددگار تھے حضرت زندہ فیل   پکڑ لاتے تھے لوگ تب زندہ فیل
بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم   اٹھا کرتے تھے لجّے لطمے بہم
ہر ایک موج اس کی سمندر کی لہر   کنارے پہ گرداب غرقاب قہر
یہی جنگل اس جھیل کے آس پاس   درختوں کا انبوہ نے کا اگاس
اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ   اسی بن میں گور و گوزن اور رنگ
اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے   وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے
اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ   اسی بن میں یہ صید بندی کا چاؤ

اسی بن میں تھے خوک خاموش رنگ — کیا اس سور بن نے لوگوں کو تنگ
اسی بن میں رہنا اسی بن میں راہ — وہیں شام کا حسن لطفِ پگاہ
اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت — ہوئے صید بری و بحری بہت
وہیں مچھلی بکتی تھی دمڑی کی سیر — ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر
کہ اس آب کا ہضم دشوار تھا — کہ جوں آب شمشیر دم دار تھا
شغال اور خرگوش بھی سے گئے — شکاری سگ ان کو اچک لے گئے
غزل سے لگا ہے بہت میر دل — کہ اس مثنوی میں کہیں متصل

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہ نامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شاہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دل شاعراں رشک سے ہے دونیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستاں — ہوا کوئی کہانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر — کہے صید نامے بہت بے نظیر
زہے آصف الدولہ دادگر — سخن ور نواز اور عاشق ہنر
دہش سے جہاں اس کے رونق پذیر — وزیر ابن دستور ابنِ وزیر
کرم بھی کرے تو جہاں در جہاں — کفِ جود خورشید سا زر فشاں
سراپائے احساں تمامی صمم — ہمہ تن مروت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار
قضائے غزل اک جو باقی کہوں — سخن آگے موقوف چپکے رہوں
بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

مثنوی ساقی نامہ

ہے قابلِ حمد وہ سر انداز | جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز
اُس کو مئے حسن نے جھکایا | ہستی کا نشہ اسی سے پایا
پی اُن نے شرابِ خود پرستی | طاری ہوئی اُس پہ زور مستی
وہ مست شراب ناز ہے فرد | خورشید ہے اس کا جام پُر درد
ہے گردشِ چشم اس سے افسوں | پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
ظلمت ہے دُردی کی تہ سے احول | آخر ہے وہی، وہی ہے اوّل
عالم ہے قرابۂ مئے فام | ہے دورِ سپہر گردشِ جام
مشہور جہاں جو کیف و کم ہے | بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مست نیاز ہے حرم میں | وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
ہے آب رُخِ زمانہ اُس سے | روشن ہے تمام خانہ اُس سے
مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے | صہبا میں جو دل کشی ہے وہ ہے
شمشاد ہے سرفراز اس سے | گل دیدۂ نیم باز اس سے
خوگراے ناز پیشگی ہے | وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے
جو عکس پڑا ہے جام مے میں | آتی ہے صدا اسی کی نے میں
ہے جلوہ گری میں یاں بصد ناز | وہ مست گدازہ سر انداز

سو رنگ ہیں اُس کے یاد رکھ تو — ہر جلوہ سے دل کو شاد رکھ تو
عالم میں جو کچھ نمود میں ہے — ہر لحظہ اُسے سجود میں ہے
کر یاد اُسی کو اور مے پی — جیتا رہے کوئی دن تو خوش جی
اب روئے سخن چمن کو کریے — مینائے دل اور مے سے بھریے
آئی ہے بہار مے گساراں — پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں
آئی ہے بہار دہر خیاباں — ہے لطفِ ہوائے گل بداماں
آئی ہے بہار زہد کیشاں — ہے توبہ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغ گلزار — کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ — مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی — معذور رکھ اب بہار آئی
گل بادِ صبا کے تا کمر ہے — دامانِ بلند ابر تر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں — تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مئے ناب دے ہوا ہے — اک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا — چھلکے ہے ہوا سے رنگ مے کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ — ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں — آب رخ کار سبز پوشاں
تحریک نسیم دم بدم ہے — تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی — اُٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا — رنگ گل و لالہ زور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں — بلبل کا دماغ مے کشی میں
ہر شاخ ہے شوخ جام در دست — نرگس سا ہے کسو کی نرگس مست

ہے رنگ ہوا کا آفتابی جو میں ہیں نہال جوں شرابی
چشمک کرے ہے حباب جو کا یعنی کہ ہے دور اب سبو کا۔
ساقی تارے کہ ذوق مل ہے
مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے

ہو صرف شراب کاش ساقی یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی
بے ساغرِ مے خنک ہے جینا رکھتا ہے شگوں شراب پینا
لا بادۂ کہنہ سالِ نو ہے سجادہ بھی بابت گرو ہے
دروازۂ میکدہ کھلا ہے ہر پیر و جواں کو الصلا ہے
انیار سے ہے ہر ایک سمت جوں تاک لیتے نہیں نام دامن پاک
ہر مغبچہ جام زیر سر ہے ہر گوشے میں عالم دگر ہے
مستی نگاہ عقل دشمن خوبی خرام مرد افگن۔
کہتے گئے صاحب کرامات ہم ہی نہیں قابل خرابات
جو لوگ کہ اس جگہ سے اٹھے کب حلقۂ خانقہ سے اٹھے
یاں پیتے ہیں جام بے خودی کا ہے دور تمام بے خودی کا
مستی ہے ہر ایک صبح صد بار خورشید کا سر ہے اور دیوار
ہے قابل سیر خرقہ پوشاں دریا دلی شراب نوشاں
ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں کشتی ہے شہ و گدا کی صف میں
ہر کوچہ میں رہتی تھی منادی تا رسم خبر دوری اٹھا دی
از خود شدن اک مقام ہوگا وہ مرتبہ یاں مدام ہے گا
گو پسہ ہے یہ دور پیہ کہاں تک اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک

بے خود ہو کہ یہ حجاب اٹھے — داریاں سے کہیں شتاب اٹھے

پہونچیں ہیں فنا کو بے خودی سے — پاتے ہیں خدا کو بے خودی سے

پی جرعۂ دہوش کو دعا کہہ — ہر بادہ فروش کو دعا کہہ

جوشش میں ہے بادۂ کہن سال — عبرت ہو جسے خوش اس کا احوال

اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقت وداع ہوش آیا

کھینچوں میں کہاں تلک دم سرد — ساقی وہ شراب شعلہ پرورد

وہ دارو ئے دردِ بے حضوراں — وہ مایۂ نورِ چشم کوراں

سرمایۂ عمر جاودانی — یعنی ہے وہ آبِ زندگانی

وہ میوۂ خوشش رسیدہ بارے — وہ عیش دل گزیدہ بارے

آئینۂ حسنِ خود پسنداں — زینت دہِ عنبریں کمنداں

وہ رنگِ رخ بہار یعنی — وہ بادۂ خوش گوار یعنی

یاقوت گداز دادۂ عشق — یعنی وہ ہے جام بادۂ عشق

وہ لطفِ ہوا وہ سیر مہتاب — وہ شعلۂ غوطہ خوردہ در آب

وہ کام دلِ سبو بدوشاں — یعنی کہ وہ ہے شراب جوشاں

وہ موجب دل خوشی کہاں ہے — وہ دارو ئے بے ہشی کہاں ہے

وہ جس کی طرف کو ہے تہہ دل — یعنی وہ ہے ماہ شیشہ منزل

وہ آتش تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز

وہ مقصدِ جانِ ناامیداں — وہ روسیہی روسفیداں

وہ رونق کارگاہِ شیشہ — وہ شوکت یادگار شیشہ

وہ جس سے ہے توبہ مو پریشاں — وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں

وہ دامنِ خشک جس سے بل جائے — ثابت قدموں کا پاؤں چل جائے

وہ سرخیِ چشم خوب رویاں | اسبابِ خرابیِ نکویاں
وہ دلبریِ خود سر و شر آئیں | وہ رہزنِ راہ دین و آئیں
وہ جس سے غبار دل سے دھوؤں | مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں | اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
لا اس کو جو آستیں جھاڑوں | پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں
بے ہوش شراب ناب رہیے | یوں تابہ کجا کباب رہیے
ہے مستی بے خودی ضروری | کھل جائے مقام بے شعوری
دل غم سے بھرا ہے زور میرا | تا عرش گیا ہے شور میرا
دل میں ہے کہ گل کی اور رو ہو | شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو
ہر گام پہ لغزشِ قدم ہو | تکلیف شراب دم بدم ہو
جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں | جب کاکل صبح ہو پریشاں
جب نکلے ستارۂ سحر گہہ | کر نعرۂ الصبوح یک رہ
ہے ذوقِ شراب صبح گاہی | بے لطف نہیں ہے رو سیاہی
جب ہووے نشہ ترنگ آوے | مستی مجھے باغ میں لٹا دے
شیشہ مرے منھ کو تو لگا دے | کر ایسی نگاہ جو جھکا دے
جب بے خودی تمام آوے | سر پر مرے ہوش رو کے جاوے
بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا | ہو ورنہ قبول عذر میرا

مثنوی ننگ نامہ

پاؤ توفیق ٹک تو سر کو دھنو — یہ بھی اک سانحہ ہے میر سنو
ہم کو در پیش تب سفر آیا — جب کہ برسات سر ہی پر آیا
ابر ہونے لگے سپید و سیاہ — پانی رستوں میں کیچ ساری راہ
بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب — منھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب
سو تو کملی نہ پٹو نہ نوئی — سایہ گستر نہ ابر بن کوئی
ابر ہی بے کسی پہ روتا تھا — ابر ہی سر کا سایا ہوتا تھا
کیچ پانی میں کپڑے خوار ہوئے — وو ہمیں گاڑی میں جا سوار ہوئے
رہروی کا کیا جو ہم نے میل — پھنس چلے کے تھے بہل کے بیل
آسماں آب سب زمیں سب کیچ — خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ
شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی — پانی کی سطح پر نگاہ پڑی
لجے لطمے کا کیا کہوں میں اوج — باتیں کرتی ہے آسماں سے موج
دامن ابر پاٹ دریا کا — دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا
ہوش جاتا تھا دیکھ جوشِ آب — گوش کرتا تھا کر خروشِ آب
آب تہ دار اور تیرہ بہت — لہر اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت
پانی پانی تھا شور سے طوفان — دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان۔

ہمرہِ موج سیکڑوں گرداب / ساتھ تھی صا تری کہ چشم حباب
ناؤ میں پانوں ہم نے بارے رکھا / خوف کو جان کے کنارے رکھا
جزر و مد سب حواس کھوتا تھا / خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا
جب کہ کشتی رواں ہوئی واں سے / جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے
موجہ اُٹھنے لگا تو طوفاں زا / لجہ آیا نظر سو عماں زا
کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم / ناخدائی خدا نے کی اس دم
بلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ / عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ
ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا / خوف سے جی بھی ڈوبا جاتا تھا
خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق / بیخودی سے ہوا تھا استغراق
بہتا بہرتا تھا خضر کشتی پاس / غوطے کھاتے تھے حضرت الیاس
بد بلا سے تھے ہم کنار ہوئے / تھا خدا ہی تو بلّی پار ہوئے
کسو درویش کا تھا یمنی قدم / جا کے پہونچے جو اس کنارے ہم
ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا / گو ہر جان سے ہاتھ دھویا تھا
اس کنارے کا جو اثر پایا / ہم تلاطم کشوں میں جی آیا
اس طرف اترے آب کے جا کر / میر اور پیر صاحب و چاکر
شکر لب پر دلوں سے محو گلا / کسو ناکس سبھوں سے خضر ملا
پار کا گنج تھا جو شاہ درلا / سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا
فاصلہ ایک کوس کا تھا بیچ / راہ یاں سے تھی واں تلک سب کیچ
تھے بہت بیچ میں نشیب و فراز / پہونچے واں شام کھینچ رنج دراز
سو نہ جاگہ تھی نہ مکانِ بیت / چار دوکانیں ایک چھوٹی سیت
جا کے حیراں ہوئے کدھر جائیں / سر گھسیڑیں جو تنگ جگہ پاویں

تنگ و دو ہر طرف لگے کرنے   تسپہ پڑتے تھے مینہ کے بھرنے

کوئی میداں میں کوئی چھپر میں   کوئی در میں کوئی کسو گھر میں

گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ   جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ

بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو   کون پوچھے نفر مصاحب کو

ڈھونڈتے ڈھونڈتے سرا پائی   ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی

رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان   جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان

کچھ پکانے کا جب سوال کیا   میں نے اظہار اپنا حال کیا

یاں جو لائے ہیں مجھ کو اپنے ساتھ   زندگانی مری ہے ان کے ہاتھ

پہونچے ہے ان کے رو بروسے طعام   صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام

اور پکوائیے تو زاید ہو   خاصے سے اپنے اور عاید ہو

جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے   کچھ رہا سو اٹھا دیا میں نے

سُن کے اک دل سے کھینچی اُن نے آہ   اور بولی کہ واہ صاحب واہ

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے   چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے

کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاوینگے   ہم کچھ ان کے سبب سے پاوینگے!

سو تو نکلے ہو کیہ رے یا لم تم   ہو گرا جیسے شاہ عالم تم

کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات   دیکھئے کس طرح سے گذرے رات

صابقے ہیں ایسے بھی اتارے کے   سو گئے بخت گھر ہمارے کے

میں کہاں مہترانی جی بولو   مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو

بعضے کھاتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں   بعضے مجھ سے بھی آتے جاتے ہیں

بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام   صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام

یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ   غازی آباد کو گئے سب پوچ

راہ طے کر سرا میں جا اترے | کچھ ستم دیدہ پاس آ اترے
صاحب اترے حویلی میں آ کر | باغ میں اس کے سب نفر جا کر
بار ور تھے درخت سب یہ بھی | پھل و لیکن کنھوں نے پایا بھی
اس بھی منزل میں ایک روز رہے | گذرے جس طور کوئی کس سے کہے
لوگ جس دم سوار ہونے لگے | اور اسباب بار ہونے لگے
سو ہنی اس رداروی میں گئی | لوگ تھے مضطرب جگہ تھی نئی
وحشت اس کو زبس کہ طاری ہوئی | سر پٹک کر کسی طرف کو موئی
ایدھر اودھر تلاش کر دیکھا | گم شدہ کو نہ پھر نظر دیکھا
ساری بستی میں جستجو کو گیا | دیر تک یہ خیال سب کو رہا
جن کی آتی ہے ایسے جاتے ہیں | کہ نہ پھر کھوج ان کا پاتے ہیں
مرگ تھی اس کی اس جگہ تقدیر | بلی تھی یا کہ گربۂ تصویر
رنگ جیسے کہ وقت گرگ و میش | یعنی سرخی تھی کم سیاہی بیش
جناے مالوف تھی وہیں رہتی | ان سے کچھ کچھ نگاہوں میں کہتی
کیا نفاست مزاج کی کہیئے | ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیئے
خال جوں پھول گل کترتے ہیں | یا کہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں
چوہے پڑیا پہ ان نے کب کی نظر | رجع کا کرنا نہ فرض تھا اس پر
مو ہنی بھی تو تھی بہن اس کی | نسبت اس کی تھی وہ بہت گستگی
پاوے جو کچھ سو مار کھاوے یہ | ایک کیا چار چار کھاوے یہ
جانور مارنا تو ہے یک سو | تیز پنجہ کیا نہ ان نے کبھو
یہ نزاکت اسی کو بن آوے | موش دشتی کو دیکھ ڈر جاوے
ان نے مارے ہیں ایسے کتنے ڈھولنس | گھونس دیکھی تو ہووے کوئی گھونس

یہ چھچھوندر کے بولتے بھاگے — وہ پڑی سوتی بھی ہو تو جاگے
چھپکلی سے یہ پھیر منھ کو لے — وہ جفاکار جلینہ بد جی دے
یہ پری سی بھی جو خرام کرے — وہ جو اچھلے تو دھوم دھام کرے
کبک اس کی خرام کی عاشق — جانور اس کے نام کے عاشق
غرض افسوس کی جگہ بلی ، — اب کہاں گو کہ چھانیے دلی
ایسی بیگم مزاج بلی کھو — بیگم آباد ہم گئے یارو
واں سے میر بھی سبھوں نے کی منزل — کیچ پانی اگرچہ تھا حائل
گرتے پڑتے پہونچ گئے مارے — ہم جفائے سپہر کے مارے
واں سے لاور ننگ پھر واں سے — جائے واں تنگ آگئے جاں سے
اک گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں لنے کھائی!
چھوٹی پھاٹی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا — ہر قدم ایک غار و چقر تھا
کھنڈرے اس میں تین چار مکان — جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی ساری کھیتے ناج کے تھے — برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے
خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا — بنگلا اک لا کے اس کے بیچ دھرا
خشتی پائے اگر نہ بنواتے — باؤ میں اک سمیت اڑ جاتے
باؤ جنگل کی تند کچھ نہ رکاؤ — مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ
اک گڑھی جس کی سیکڑوں راہیں — واں ٹھہرنے کو چاہیئے باہیں
وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ — یا کوئی جوگی جو کرے واں جوگ
ورنہ مشکل بہت ثبات قدم — دل میں اک ہول ہی رہے ہر دم
باؤ سی دن کو سائیں سائیں کرے — رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے

گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار بے زری سے بنانا ہے دشوار
ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب پردہ کا ہے کا پھر ہے رفع حجاب
کار پردازوں کو تقیّد ہے شور ہے گالی ہے تشدد ہے
وے بچارے بہانے کرتے ہیں رات دن لوگ چو کی بھرتے ہیں
کہیئے ان سے تو یہ ملے ہے جواب کس کے گھر سے بنادیں لاکے شتاب
ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے صبح بقال کا تشدد ہے
بنیا منھ کو چھپائے جاتا ہے روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل
سوچلیں ہیں جب تو بھول جاتے ہیں بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں
تم کو دیوار یا کہے ہیں گے یاد ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد
کس کو موسیں کہاں سے کچھ لادیں دال آٹا جو تم کو پہونچا دیں
تم کہو دال ماش کی ہے زبوں یاں بہم پہونچے ہے جگر ہو خوں
اور دو چار روز یہ بھی ہے ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے
فصل ہونے ابھی نہیں پائی پیشگی سب سے قرض لے کھائی
جس سے جھوٹے ہوئے ہیں ہم دس بار جو ٹٹا وہ کہے ہے ساہوکار
ماش کی دال کا نہ کریئے گلا گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا
چاہتے ہو تو مول لو اک بز ورنہ بیٹھے ہو بنے جز بز
جی اگر چاہے کوئی ترکاری گول کدّو ملے بصد خواری
بھنڈی بیگن کے نام دھینڈس تھا اروی توری بغیر جی بس تھا
جز کدو یاد ے کلو ماڑھو کیا یعنی کچھ اور واں تھی کدو کیا
دار و گولی کے کچھ نہ تھے اسباب ماش کی دال کھاتے تھے احباب

جو گڑھی میں نہ چھوٹے یوں گوز — بجتی رہتی تپک کہاں سے زور
گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام — تس میں تسا ئے جانور اقسام
جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس — کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس
بشتہ وکیک اور کتی بھی تھی — جن کے کاٹے اچھلتی پتی تھی
ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے — شب گردوں سے بدن جلے جاتے
ان کے کاٹے بدن پہ رانا ہے — مرچ جدوار پھر لگانا ہے!
ایک دو دن جلا فراغ ہوا — اس کی جاگہہ سیاہ داغ ہوا
نہ کھجاتے کھجاتے سارے گھسے — چیچھے چپچپے ہوئے جو دانے پسے
دن کو وہ صورت طعام ہوئی — رات کو نیند یوں حرام ہوئی
کتوں کے چار دل اور رستے تھے — گتے ہی واں کہیے تو بستے تھے
دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے — چار لوگوں کے گھروں میں بیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکو تے — کھود مارے گھروں کے سب کونے
کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے — خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک — شور عف عف سے آفت آئی ایک
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے — روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آکے ڈیگچیا چاٹا — ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا — پھر پیا آگے تیل اگر چھوڑا
گھور نے اک لگا اندھیرا کر — ایک نے اور ایک پھر آکر
گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیئے — ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیئے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں — لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جب کہ ہڈی پہ چار چار لڑیں — گوشت پہ بھیڑیئے سے دوڑ پڑیں

ایک کے پیچھے ایک روز و شب — لینڈی سی واں نہ بند ہو رہی تھی کب

کتّے ہی واں دو چار رہتے ہیں — دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں

جاگتے ہو تو دو بدو کتّے — سو کر اٹھو تو رو برو کتّے

سر پہ دربان کے بلا ہی رہے — کتّا ایک آدھ گھر میں جا ہی رہے

منھ میں کف دور دور کرنے سے — حال بے حال شور کرنے سے

تو کہے سن کے وہ گلا پھاٹا — باؤلے کتّے نے اسے کاٹا

کتوں کی کیا سماجتوں کو کہیں — چیچڑی سے رات دن لگے ہی رہیں

باہر اندر کہاں کہاں کتّے — بام و در چھت جہاں تہاں کتّے

جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی — رووے ہے اپنی جان کو کوئی

یاں طرف سے چپڑ چپڑ کی صدا — یعنی کتا ہے چکّی چاٹ رہا

ایک چھینکے کو منھ میں لے آیا — ایک چوٹھے کو کھودتا پایا

ایک کے منھ میں ہانڈی ہے کالی — ایک نے چلنی چاٹ ہی ڈالی

تیل کی کپی ایک لے بھاگا — ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا

کتے یارو کہ جان کا تھا روگ — جاں بلب ہوں نہ کس طرح سے لوگ

آدمی کی معاش ہو کیونکر — کتوں میں بود و باش ہو کیونکر

بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد — کر بیابان سخت سے وے یاد

چار چھپر کہیں چماروں کے — سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے

پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ — ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ

چھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے — سو بھی میدان میں اکیلی ہے

ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں — زرد ہو ہو گئے ہیں لب بے نان

لوگ ایسے مکان سب ایسے — ایسی جا گر سے اچٹیں دل کیسے

اور جو چار گھر نظر آئے — ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کولی چمار تھے کوئی — فاقوں کے زیر بار تھے کوئی!
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے — سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں — جان کھا جائیں کچھ نہ جیتک لیں
اس سے آگے بڑھے تو دھینور تھے — آگے پچھڑے انھوں کے کچھ گھر تھے
اور آگے گئے تو تھا بازار — اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا — تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے ساتواں اور تھوڑے چنے — چھبڑوں میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال — نانوں کو کہتے تھے اسے بقال
اس کا عامل کے یاں اٹھا پایا — ان نے جیسا کیا تھا سو پایا
ایک کنجڑے کے چار گٹھی پیاز — تس پہ اس کو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی — اس پچھندر میں کچھ بھی بھادرگ تھی
ایک دوکان تھی پنساری کی — ان نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی — زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے — بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں — میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا — دیوے کچا وہی بتا دھنیا
ان میں دو دانے اور سب کنکر — دیئے کاغذ میں ہاتھ لپکا کر
لونگ چور انفر سے منگوایا — لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا رہیں سے کریئے قیاس — آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس
اور دس بیس گھر گنواروں کے — اور دو چار فاقہ ماروں کے

پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں — یہی خانہ خطیب کا تھا واں
نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم — اس پہ سید امام واں کی قوم
بندے میں جن کا تھا خدا نہ کوئی — اس طریقے سے آشنا نہ کوئی
راہ و رسم و طریق سب بدڈھب — پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب
کوسوں بھاگا اگر ملا کوئی — صحبت ایسوں سے رکھے کیا کوئی
ایک تکیہ نہ جس میں فرش کاہ — حال درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو — مرضِ جوع لاعلاج اس کو
برسوں چلّا کے نا امید ہوا — چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آتے جاتے سے اُن نے جو پایا — اُسی پر رہ گیا وہی کھایا
گرد جو چار خاک کے سے ڈھیر — جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر
اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم — پر کبھو بلی بھی نہ دیکھی ہم
کچھ نہ دیکھا ہم اُن بھی گوروں سے — کام نکلا سو اپنے زوروں سے
کی توجہ جو ٹک دروں کی اور — دل جگر پر پڑا مرے کچھ زور
جس سے چھاتی میں درد ہونے لگا — رنگ چہرے کا زرد ہونے لگا
پھر زمینداروں میں نفاق ہوا — یہ عجب اور اتفاق ہوا
دولتوں کا اک جدا ہی مطلب ہے — یہ کہے روز وہ کہے شب ہے
آس پاس اس گڑھی کے آئی جھیل — گم تھے برسات میں طریق و سبیل
ایدھر اودھر اتر کے پانی جاؤ — ٹھہرے پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ
اُس سے واں کی ہوا بہت مرطوب — ہووے نزلہ زکام بے اسلوب
کتنے زوروں میں ہوتی ہے کھانسی — ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی
پھر وہ درجہ ہے جس میں ہووے دق — یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق۔

۱۸ پڑی آفت خطر تھا سِکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آجاتے تو قیامت تھی
مال و جاں غرض سب کی رخصت تھی
نہ کوئی داد رس نہ وقت داد
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد
کیا کڑھب چرخِ کج نے پھینکا تھا
پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی
اس بلا سے رہائی کی اپنی
بس قلم ہے صریر تیری تند
شور سے تو پڑا جہاں میں ڈند
بد زبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ
ایسی باتوں سے میں کیا ہے فراغ
ہو چکی صاحبوں کی فرمائش
چپ رہ اب ہے زمانِ آسائش

مثنوی در مذمتِ دنیا

سُنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل
کہ اس کاروان گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے سب کہ در پیش ہے
سبھوں کو یہی راہ در پیش ہے
کبھو کے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی
بجا ہی کیا کوس رحلت مدام
کنھوں نے بجتا سنا یاں مقام
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود و باش
گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار
تہہ خاک سب کا ہے دار القرار
نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی
وہ رنگینی باغ کیا ہو گئی
ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا ۔ چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ ۔ رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ
رہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی ۔ رکن ہے جہاں باد کی لاگ تھی
نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں ۔ گلستاں کو پا دیں گے ہو کا مکاں
زمیں کا رہے گا یہی کیا سماؤ ۔ لپٹ جائیں گے آسماں جیسے تاؤ
سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب ۔ چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب
جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب ۔ نہیں جائے باش اور جلسہ عجب
بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں ۔ عیاں ہے کہ کہتے ہیں جان کو رواں
جوانی گئی موسم شیب ہے ۔ شہود ایک دو روز کو غیب ہے
ہنسوں کیونکہ ہستی میں دنداں نما ۔ کہ ہے جائے دنداں ہی دنداں نما
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت ۔ گئی واشد اب دل رکا ہے بہت
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام ۔ مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام
کریں لمس کیا ہر گھڑی ہے صداع ۔ نہیں لذّت اکل و شرب و وقاع
بلا ارتعاش تنِ زار ہے ۔ ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف ۔ نہیں یاد آتا ہے دو شنیدہ حرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے ۔ کہوں کیا گذرتی ہے خاموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے ۔ سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ ۔ کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ
نہ کچھ یوں نہیں عینک نظر چڑھ گئی ۔ بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی
نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر ۔ کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
رہیں دیکھ بھو حرف نان ہو حریف ۔ رہا سننے کے گوں نہ سمع شریف

صد افسوس لطفِ سماعت نہیں　　صدا دور سے جیسے آوے کہیں
نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا　　جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی　　سفیدی مو سے سحر ہو گئی!
بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار　　کرے کون خوباں سے بوس و کنار
جو یہ چال ہی جا رہے ہیں ہم اب　　دموں پہ غرض آ رہے ہیں ہم اب
کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق　　جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے .پھلتے رہے　　تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم　　یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
کہیں بس نہیں اپنے ٹک پانو دست　　کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت
جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں　　اگر منھ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور　　دے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
جسدِ ناتواں جائے مہمان تنگ　　سخن منھ پہ آوے ودائی کے رنگ
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ　　در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی　　عزیزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آ گئی　　مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھرا گئی
چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش　　کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش
وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے　　پھر اٹھ بیٹھوں تو جی جلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا　　اکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میرؔ ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

۱۰۔ سحر البیان	از میر حسن
۱۱۔ گلزار نسیم	از پنڈت دیا شنکر نسیم
۱۲۔ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر	از ڈاکٹر محمد حسن
۱۳۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات	مرتبہ خلیق احمد نظامی
۱۴۔ اردو کے ادبی معرکے عہد سودا تا شرر و چکبست	از امیر حسن نورانی